# بدن کی خوشبو

(افسانے)

مجاہدالاسلام سمیلوی

# بدن کی خوشبو

گلوں کی مہک لگے تیرے بدن کی خوشبو
مجھے ہر عکس تیرا عکس ہی دکھائی دے

# بدن کی خوشبو

(افسانے)

مجاہدالاسلام سمیلوی

حفیظ جالندھری لٹریری سوسائٹی،

جالندھر (پنجاب)

# BADAN KI KHUSHBOO
(Afsana)

by

*Mujahid-ul-Islam Samailvi*

Year of 1st Edition 2012
ISBN 978-93-
Price Rs. 125/-

نام کتاب : بدن کی خوشبو (افسانے)
مصنف : مجاہدالاسلام سمیلوی
346/A/8، اوتار نگر، جالندھر سٹی، پنجاب۔144003
موبائل : 09779280656
ای میل : mujahiddr@gmail.com
مرتبین : ڈاکٹر پرویز شہریار، سالک جمیل براڑ
سنِ اشاعت اوّل : ۲۰۱۲ء
قیمت : ۱۲۵ روپے
ٹائپ اینڈ ڈیزائن : براڑ آرٹس Mob:09256033695

## انتساب۔۔۔۔۔۔

عہدِ حاضر کے سرکردہ نقاد، دانشور، ماہرِ لسانیات

اور اردو کے بے لوث خدمت گزار

**پدم بھوشن پروفیسر گوپی چند نارنگ**

کے نام

تیرا اندازِ سخن شانۂ زلفِ الہام<br>
تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل

# فہرست


| | | |
|---|---|---|
| ◆ حرفِ اوّل | مجاہدالاسلام سمیلوی | ۷ |
| ◆ مقدمہ | ڈاکٹر کیول دھیر | ۱۲ |
| ◆ حرفے چند | ڈاکٹر مشتاق صدف | ۱۴ |
| ◆ حرفِ آخر | ڈاکٹر پرویز شہریار | ۱۶ |


## افسانے


| | |
|---|---|
| ◆ بدن کی خوشبو | ۱۹ |
| ◆ اپینڈس | ۲۶ |
| ◆ آشیرواد | ۳۶ |
| ◆ بلاؤز | ۴۲ |
| ◆ کانوینٹی لڑکی | ۵۳ |
| ◆ لیگی | ۵۶ |
| ◆ پیسہ | ۶۲ |
| ◆ خودکشی | ۷۱ |
| ◆ چوہیا | ۸۲ |
| ◆ دھچکا | ۸۸ |
| ◆ کوڑھ مغز | ۹۶ |
| ◆ لمس کی لذت | ۱۰۵ |

# حرفِ اوّل

سب سے پہلے اللہ رب العزت کا نام جو فرماتا ہے۔ ''جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا۔'' اور پھر اس کے بعد اپنے والدین کی عظمت و محبت کے نام جنہوں نے اس کے اس فرمان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جہاں میری توتلی زبان سے ''لفظ و معنی'' کی ادائیگی کروائی وہیں میرے ننھے منے ہاتھوں میں قلم جیسا حساس آلہ تھمایا جس کی بدولت ہی آج میں اس قابل ہوا ہوں کہ اپنے بکھرے ہوئے افسانوں کو مجموعہ کی شکل میں نذرِ قارئین کر سکوں۔

میری زندگی کا ابتدائی زمانہ جہاں دینی اداروں میں مذہبی علم و فنون کی تعبیر و تشریح میں گزرا وہیں اعلیٰ تعلیم کے لئے میرا شوق مجھے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی و جواہر لال نہرو یونیورسٹی جیسے سرکردہ اداروں میں لایا۔

علی گڑھ میں جہاں مجھے پروفیسر قاضی عبدالستار جیسی علمی، ادبی اور عبقری شخصیت کی شاگردی نصیب ہوئی وہیں کلاسیکل لٹریچر کی تعبیر و تشریح کے لئے پروفیسر نورالحسن نقوی و پروفیسر عتیق احمد صدیقی کی قربت نصیب ہوئی۔ ورلڈ لٹریچر (World Literature) جہاں پروفیسر ابوالکلام جیسی علم و فضل سے آراستہ شخصیت سے پڑھا وہیں میں نے عروض و بلاغت کو پروفیسر قاضی افضال جیسی علم و کمالات سے آراستہ شخصیت سے سمجھا۔

شعبے کی طرف سے تعلیمی افضلیت کے لئے جہاں مجھے ''مولانا الطاف حسین حالی ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔ وہیں مجھے راس مسعود ہال کے پرووسٹ پروفیسر محمد عثمان نے بیسٹ اسٹوڈنٹ آف دی ہال (Best Student of the Hall) کے ایوارڈ سے

سرفراز کیا۔ یہی نہیں انہوں نے کئی نام نہاد لکھاریوں پر ترجیح دے کر مجھے ہال میگزین ''مسعود'' کی ایڈیٹر شپ کے لئے بھی منتخب کیا اور ان کی توقعات پر پورا اترتے ہوئے میں نے مسعود کا علی گڑھ نمبر نکالا۔ جس سے جہاں یونیورسٹی بین الاقوامی حلقوں میں متعارف ہوئی، وہیں مجھے بھی قومی و بین الاقوامی شخصیتوں سے بھی رابطہ قائم کرنے کا موقع ملا۔

جواہر لال یونیورسٹی میں جہاں مجھے ابتدائی دنوں میں پروفیسر محمد حسن جیسی شخصیت سے تقابلی ادب (ComparativeLiterature) پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ وہیں میں نے اپنے تحقیقی کام کے لئے پروفیسر صدیق الرحمان جیسی علمی وادبی شخصیت کو ترجیح دی۔ پروفیسر شاہد حسین ڈپلوما ان ماس میڈیا میں میرے استاد رہے اور غالباً انہی کے لیکچر کا اثر تھا جب مجھے کیریئر کے انتخاب کا مسئلہ درپیش آیا تو میں نے صحافت کو ہی ترجیح دی اور جالندھر کے مشہور اخبار ''روزانہ ہند سماچار'' سے وابستہ ہوگیا۔ فی الوقت میں جہاں ہند سماچار میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے خدمتِ صحافت کر رہا ہوں۔ وہیں پچھلے دنوں اخبار میں افسانہ ایڈیشن انچارج کی حیثیت سے بھی میں پیش پیش رہا ہوں۔

میں اپنی اب تک کی صحافتی زندگی میں جہاں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ صحافت کا اصل مقصد مواد کی ترسیل ہوتی ہے۔ ایک اچھا صحافی وہی سمجھا جاتا ہے جو کم سے کم لفظوں میں بلا کسی پیچیدگی اور ہیر پھیر کے اپنی بات کو عام قاری تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دوسری طرف چونکہ یہ کام بندھے ٹکے وقت میں انجام دیا جاتا ہے اس لئے یہ پیشہ اس بات کا بھی متقاضی ہے کہ ایک صحافی وقتاً فوقتاً حسب موقع برجستہ لکھے۔

ادبی تخلیقات میں میرا نقطہ نظر اس کے بالکل برعکس و مخالف رہا ہے۔ اس میں کہیں تفصیل کی ضرورت پڑتی ہے، تو کہیں اختصار سے کام لیا جاتا ہے اور زبان بھی معیاری استعمال کی جاتی ہے۔

ایک اچھے ادیب کے ہاتھ میں زبان اس طرح ہوتی ہے، جس طرح زرگر کے ہاتھ میں پگھلا ہوا سونا، بس ضرورت موزوں طبیعت کی ہوتی ہے۔ وہ جس طرح چاہے

ڈھال سکتا ہے۔

جہاں تک رہا میرے ان افسانوں میں موضوعات کا سوال تو میں نے انہی موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جو میرے گہرے مطالعے ومشاہدے میں آئے ہیں۔ان میں کچھ جزئیات بہت زیادہ منزہ ومتشرع تھیں تو کچھ بہت ہی زیادہ ارزل واسفل۔مگر جن مشاہدات نے بالخصوص میری توجہ اپنی طرف منعطف کی ہیں۔وہ موخرالذکر رہی ہیں۔ان مشاہدات نے جہاں میرے وجود کو جھنجھوڑا ہیں وہ میری ذہنی کتھارس کا سبب بھی بنے۔

آج انسانی معاشرے میں ہر طرف نفسانفسی اور مسابقت کا دور دورہ ہے، ہر آدمی دنیاوی مال ومتاع اور جاہ وحشمت کی تگ ودو میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کے لئے کوشاں ہے جس کا نتیجہ ذہنی تناؤ اور تشنج ہے۔

ایسے میں، میں نے اپنے ان افسانوں میں کہانی در کہانی کے گورکھ دھندوں میں الجھنے کی بجائے ان کے اصل موضوع پر ہی توجہ کو مرکوز رکھا ہے اور کوشش کی ہے کہ قاری کی دلچسپی بلا کسی الجھاؤ اور پیچیدگی کے شروع سے آخر تک کہانی سے قائم رہے۔

صحافت اور ادب کے فرق کو ملحوظ رکھنے کے باوجود ایک بات جو میں نے شدّت سے محسوس کی ہے وہ یہ ہے کہ آج پاکستانی اردو میں جہاں انگریزی کے ساتھ ساتھ وہاں کی علاقائی زبان جیسے پنجابی، سندھی، بلوچی وپشتو کے الفاظ کثرت سے داخل ہورہے ہیں، وہیں ہندوستانی اردو میں یہاں کے فضلاء وادباء کا طبقہ انگریزی کے الفاظ کی شمولیت کو تو کسی حد تک گوارا کرلیتا ہے مگر ہندی اور یہاں کی دیگر علاقائی زبانوں کے عام فہم الفاظ کی شمولیت کو قطعاً ممنوع سمجھتا ہے۔

اس رویے کے برعکس ہندی و پنجابی کے رواں ،موزوں اور عام فہم الفاظ جو میرے تخلیقی عمل کے دوران میری نوک قلم پر بے ساختہ آگئے ہیں۔میں نے اپنے افسانوں میں ان کو بھی روا رکھنے کی کوشش کی ہے۔اس سے جہاں مجھے ابلاغ میں ایک طرح کی وسعت نصیب ہوئی ہے۔وہیں دوسری طرف مجھے ذہنی آسودگی کا بھی احساس ہوا ہے۔

اگر چہ میرے کرم فرما اور محسنین کی طویل فہرست ہے۔ جس میں سے ہر ایک کا ذکر میرے لئے ناممکن ہے، پھر بھی چند ایک کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ جن کی شخصیت اور علم وفضل سے میں اپنے اب تک کے تخلیقی سفر میں واسطہ و بلا واسطہ طور سے متاثر ہوتا رہا ہوں اور ان کی شخصیت میرے لئے مینارۂ نور ثابت ہوئی ہے۔

ان میں سب سے پہلا نام سرکردہ دانشور، تنقید نگار و ماہر لسانیات پروفیسر گوپی چند نارنگ کا ہے۔ اُن کی شخصیت میرے لئے ولیِ ادب کا درجہ رکھتی ہے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا اور اس کوچہ ادب میں قدم رکھا۔ ان کی کتابوں سے استفادہ کرتا رہا ہوں۔ ان کی تحریریں میرے لئے اقبال کے لفظوں میں ''بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی'' ثابت ہوئیں، میں ان سے کبھی نہیں ملا لیکن میں جب بھی انہیں پڑھتا ہوں ان سے غائبانہ ملاقات ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھار ٹیلی فون سے گفتگو کا موقع ملا انہوں نے بڑی شفقت اور محبت کا اظہار کرتے ہوئے میری باتوں کو سنا اور خندہ پیشانی سے جواب دیا جو میرے لئے سرمایہ حیات ہیں۔ میں اپنی یہ کتاب اُردو کے اسی بے لوث خدمت گزار پروفیسر گوپی چند نارنگ کے نام معنون کر کے خود کو خوش نصیب سمجھتا ہوں۔

پنجاب کی اہم شخصیت جس کا ذکر کئے بغیر میری یہ باتیں مکمل نہیں ہونگی وہ ہیں ڈاکٹر کیول دھیر صاحب۔ اگر چہ میں بہت پہلے سے ان کے ''سفرنامہ پاکستان''، ''خوشبو کا سفر'' پڑھ کر ان سے متعارف ہو چکا تھا۔ مگر ادھر جب سے میں جالندھر کے روزنامہ ''ہند سماچار'' سے وابستہ ہوا ہوں تب سے میں باقاعدہ ان کے رابطے میں ہوں، شرافت، نجابت، علمیت ڈاکٹر صاحب کا خاصہ ہے جو شخص بھی ان کے قریب ہوتا ہے وہ یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

یہاں ''ہند سماچار'' کے انچارج شام داس کھنہ اور سینئر جرنلسٹ اوم پرکاش سونی کا ذکر کرنا بھی مناسب سمجھتا ہوں۔ کھنہ صاحب کی شخصیت ایک انسان دوست انسان کی صفات سے متصف ہے وہ کم وبیش ۵ دہاکے سے ادب وصحافت کے شعبے سے وابستہ ہیں،

قدیم وجدید علوم وفنون پر دسترس و دقت نظر کی وجہ سے معاملے کی تہہ تک پہنچنے میں انہیں دیر نہیں لگتی ہے۔ سونی صاحب بڑے ہی مرنجاں مرنج قسم کے صحافی ہیں۔ صحافت کے ساتھ ساتھ صحت زبان وادب کا بھی شستہ وشائستہ ذوق رکھتے ہیں۔ ان کا در جویانِ علم وفن کے لئے ہمہ وقت بلا کسی تردد وپس وپیش کے لئے کھلا رہتا ہے۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے دوست اور ساتھی ڈاکٹر ندیم احمد، ڈاکٹر پرویز شہریار، ڈاکٹر مشتاق صدف اور سالک جمیل براڑ کا ذکر نہ کروں۔ حقیقت میں یہی وہ لوگ ہیں جن کی تحریک سے یہ مجموعہ منظرِ عام پر آیا ہے۔

ان کے علاوہ میں اپنے دوست و بہی خواہ بجرنگ بہاری تیواڑی، اپنے چھوٹے بھائی ڈاکٹر زاہد اللہ، محمد وسیم عثمانی کا بھی بہت ممنون ہوں جن کی محبت اور مشورے ہمیشہ سے ہی میرے لئے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

میں اپنی شریک حیات ندرت الزہرہ، بیٹے قتادہ اور بیٹیوں عظمیٰ وعربدا جو میری قوت کا اصل منبع ہیں، کا بھی شکر گزار ہوں۔

مجاہد الاسلام سمیلوی

# مقدمہ

اس افسانوی مجموعے میں شامل مجاہد الاسلام سمیلوی کا ہر افسانہ ایک جداگانہ موضوع ہی نہیں اسلوب اور تکنیکی انداز بھی رکھتا ہے۔ انہوں نے روایتی و علامتی اسالیب سے افسانے کی ضرورت کے مطابق بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ علامتی اور تجریدی اسالیب سے کام لینا خوب جانتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں افسانہ اپنے کرداروں کے ساتھ ساتھ قاری سے بھی باتیں کرتا محسوس ہوتا ہے نہ کہ افسانہ نگار۔ یہ ان کی فنی مہارت ہے۔ اگرچہ انہوں نے کسی قسم کی مقصدیت اور معنویت قاری پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی لیکن ہر کہانی خود بخود ایک مقصد اور معنی لئے روبرُو ہوتی ہے۔ ایک اہم بات یہ بھی کہ مجاہد الاسلام کے افسانوں کی دنیا جداگانہ ہے اور افسانہ قاری کو انگلی پکڑ کر اس دنیا میں لے جاتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ عمل نہ تو اظہار کا ہے اور نہ ہی ابلاغ کا بلکہ یہ Art of Transportation کا عمل ہے۔

اسی لئے یہ افسانے ''آج'' کے افسانے ہیں۔ لیکن اس ''آج'' میں بیتا ہوا ''کل'' بھی شامل ہے اور آنے والا ''کل'' بھی۔ یہ وہ نیا افسانہ قطعی نہیں ہے جو کہانی سے بے نیاز ہو گیا ہے بلکہ یہ خالصتاً کہانی والا افسانہ ہے اور بیحد سلیقے سے لکھا گیا اور تمام ضروری لوازمات سے سجایا گیا افسانہ ہے جو دلوں پر دستک دیتا ہے، ذہن کو چونکاتا ہے اور پھر دل و دماغ میں ہلچل پیدا کرتا ہے۔

مجاہد الاسلام سمیلوی کے افسانوں میں ایک اور خاص بات یہ کہ انہوں نے

جنسیات کو بھی شامل عمل کیا ہے لیکن ہر افسانے کا جنسی پہلو اس قدر نفسیاتی ہے کہ یہ کہیں برہنہ نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے مخصوص فنی اندازِ بیان سے جنس کو کرداروں پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ یہ ان کے قلم اور ذہنی سوچ کی پختگی ہے۔ مجاہد الاسلام سمیلوی ابھی تازہ دم افسانہ نگار ہیں ان کا قلم طاقتور ہے، ذہن کی سوچ بلند ہے، افسانے کے فن کی نوک پلک سے وہ بخوبی واقف ہیں، تحریر میں کشش اور تازگی ہے اور مجھے یقین ہے کہ آنے والے دور میں وہ ایک ممتاز افسانہ نگار کے طور پر تسلیم کئے جائیں گے۔

ڈاکٹر کیول دھیر
چیئرمین ساحر کلچرل اکیڈمی
لدھیانہ پنجاب (انڈیا)

# حرفِ چند

ڈاکٹر مجاہد الاسلام سمیلوی ہمیشہ سے ہی ادب کے ایک ذہین قاری رہے ہیں۔ وہ جواہرلال نہرو یونیورسٹی میں مجھ سے سینئر تھے۔ ایک دو ملاقاتوں میں ہی میں ان کی ذہانت کا قائل ہوگیا۔ پھر ملنے ملانے کا سلسلہ چلتا رہا۔ مجھے وہ ہمیشہ سچے لگے۔ ایک وقت تھا، ان کے خطوط اخبارات کی زینت بنتے تھے جنھیں پڑھ کر قارئین سر دُھنتے تھے۔ آج کل وہ روزنامہ 'ہند سماچار' جالندھر سے وابستہ ہیں۔

مجاہد الاسلام سمیلوی ایک طرف جہاں منجھے ہوئے صحافی ہیں وہیں دوسری طرف کھلے ذہن کے معتبر ادیب و افسانہ نگار بھی ہیں۔ ان کا افسانوی سفر تقریباً دو دہائیوں پر محیط ہے۔ اس عرصے میں انہوں نے اپینڈکس، بلاؤز، کوڑھ مغز، دھچکا جیسے بہترین افسانے اردو ادب کو دیئے ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنے معاصرین اور متاخرین سے الگ ہٹ کر کچھ کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حقیقت اور اشاریت سے وہ اپنی کہانیوں کا تانا بانا بنتے ہیں۔ ان کی کہانیاں ایک خاص تناظر کا احساس دلاتی ہیں۔ ان کی کہانیوں کی اساس بیانیہ ہوتی ہے۔ عشق، فریب، جنسی بے راہ روی، انسانی رشتوں کی پامالی، مہذب سماج میں لڑکیوں کی بے قدری جیسے اہم موضوعات کو جب وہ چھوتے ہیں تو انہیں دل فریب بنا دیتے ہیں۔ کہیں کہیں وہ ہمیں اس قدر چونکاتے ہیں کہ ہمارے احساسات و جذبات روشنیوں سے چمک اُٹھتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں ہم عصر زندگی کی دھڑکنیں شامل ہیں۔ ان کے یہاں زندگی کے مختلف رنگ، اس کی صداقتیں اور حقیقتیں اپنے سیاق و سباق کے ساتھ ظاہر ہوتی ہیں نیز اخلاقی قدروں اور تہذیبی انسلاکات کو سلیقے سے پیش کرتی ہیں۔

ان کے افسانے اختصار میں بھی ایک وسیع مفہوم رکھتے ہیں۔وہ افسانوں میں معاشی، معاشرتی مسائل اور شعور کو مختلف رنگوں میں پیش کرنے کے ہنر سے اچھی طرح واقف ہیں۔ان کے افسانوں میں جہاں شور ہوتا ہے وہاں خاموشی کی اپنی الگ زبان بھی ہوتی ہے۔

میں ان کے اولین افسانوی مجموعہ ''بدن کی خوشبو'' کی اشاعت پر دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ادبی حلقوں میں اس کی قدر افزائی ہوگی۔

ڈاکٹر مشتاق صدف
پروگرام آفیسر، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی
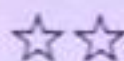
# حرفِ آخر

مجاہدالاسلام سمیلوی سے میری پہلی ملاقات جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں ۱۹۸۹ء میں ہوئی تھی۔ تب پہلی ہی ملاقات میں ان سے اُردو افسانے کے تناظر میں سعادت حسن منٹو کی فنکارانہ عظمت پر گرما گرم بحث ہوئی تھی۔ اگرچہ مجاہدالاسلام صاحب کلاسیکی ادب پر پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی کی نگرانی میں سوداؔ کے قصیدوں پر تحقیق کر رہے تھے۔ تاہم اس زمانے میں بھی ان کا ذہنی رجحان اور پسندیدہ موضوع فکشن ہی تھا۔ آج ان کا افسانوی مجموعہ میرے پیشِ نظر ہے۔ اس پر نظر ڈالتا ہوں تو ان کے افسانوں سے جنسی جبلت کی کرشمہ سازیاں ایک نمایاں وصف بن کر ان کے تخلیقی رویے میں کارفرما نظر آتی ہیں۔

مجاہدالاسلام سمیلوی جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے وابستہ رہنے کے باوجود کارل مارکس کے اصولوں سے متاثر ہونے کے بجائے سگمنڈ فرائڈ کے نظریوں سے زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے افسانوں میں جنسی حقیقت نگاری سے کام لیا ہے۔ مجاہدالاسلام سمیلوی نے متوسط طبقے کے ہندوستانی سماج کی اس سچائی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ جہاں سن بلوغ کو پہنچتے ہوئے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ہلکے پھلکے معاشقے، دل لگی اور جنسی چھیڑ چھاڑ کے ذریعے بزرگوں کی عائد کردہ صدیوں پرانی علیحدگی (Sagregation) اور پردے کی پابندیوں کی موقع ملتے ہی دھجیاں اڑا دیتے ہیں۔ ان کے اکثر و بیشتر کردار اپنی زندگی حسرت و یاس میں گزارنے کے بجائے گستاخی بر طرف جنسی لذت سے بھرپور زندگی گزارنے پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا یہی وصف انہیں دوسرے افسانہ نگاروں سے ممیز و ممتاز بناتا ہے۔

اختصار ان کے افسانوں کا دوسرا اہم وصف ہے۔ سیدھا پلاٹ اور اکہرا بیانیہ، علمی زبان اور صحافیانہ اسلوب ان کے افسانوں کے دیگر نمایاں محاسن شمار کئے جاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ادبی حلقوں میں اسے خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر پرویز شہریار
ایڈیٹر جنرل
نیشنل کونسل آف ایجوکیشن
ریسرچ اینڈ ٹریننگ، نئی دہلی

# افسانے

# بدن کی خوشبو

گور پریت سے میری پہلی ملاقات ہوسٹل فنکشن کی ڈانس پارٹی میں ہوئی اس کو کندرا کی گرل فرینڈ نے اور مجھے خود کندرا نے مدعو کیا تھا۔ لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے کو تھامے ویسٹرن میوزک کی دھنوں پر تھرک رہے تھے۔ شراب کی چسکیوں کے بعد اب کندرا بھی اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ ان لوگوں میں شامل ہو چکا تھا۔ میری مجبوری یہ تھی کہ میری کوئی گرل فرینڈ نہیں تھی جس کے ساتھ میں ڈانس کر سکتا۔ اسی طرح گور پریت کا نہ ہی کوئی بوائے فرینڈ تھا جس کو پارٹنر بنا کر وہ ڈانس کرتی۔

میوزک کی تیز دھنوں اور رنگ برنگ کی روشنیوں کے بیچ میرے لئے اپنے وجود پر قابو پانا ناممکن ہو رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے اندر خود بخود تھرکن پیدا ہونے لگی تھی۔ میں بڑی تذبذب کی حالت میں تھا۔

ایک چیز جو مجھ میں اور گور پریت میں قدرے مشترک تھی وہ یہ کہ ہم دونوں کا رشتہ کہیں نہ کہیں کندرا سے جا کر ملتا تھا۔ یعنی اس کی وجہ سے ہی ہم دونوں اس پروگرام میں شریک ہو پائے تھے۔ چنانچہ کچھ ہی دیر میں تکلف کو برطرف کرتے ہوئے گور پریت میرے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔ پھر میں نے اپنا دایاں ہاتھ اس کی کمر میں اور بایاں اس کے ہاتھ میں ڈال دیا اسی طرح اس نے اپنا بایاں ہاتھ میری کمر میں اور دایاں ہاتھ میری انگلیوں میں پیوست کر دیا۔ پھر ہم دونوں بھی میوزک کی دھنوں پر دھیرے دھیرے تھرکنے لگے۔

تھرکتے تھرکتے ہم دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب آ جاتے تھے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی سانسوں کی گرمی کو بخوبی محسوس کر سکتے تھے اور پھر جیسے ہی ایک دھن کے ختم ہونے کے بعد دوسری دھن شروع ہوتی تو پھر اس احساس ندامت کے ساتھ ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے کہ کہیں نہ کہیں ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں۔

ڈانس کے بعد ڈنر کا پروگرام تھا۔ مجھے نہ تو کندرا اور نہ ہی اس کی معشوقہ کہیں دور دور تک نظر آ رہی تھی۔ میں نے گور پریت کے ساتھ ہی ڈنر کیا۔ اچانک ایک انجان لڑکی کو اپنے اتنے قریب پا کر میری کیفیت کچھ اس قسم کی ہو رہی تھی کہ کھانا لذیذ ہونے کے باوجود اندر سے میری کھانے کی خواہش بالکل ختم ہو چکی تھی۔ میں نے بادلِ نخواستہ جلدی جلدی کھانا کھایا۔

کھانے کے بعد تقسیم انعامات کا پروگرام تھا۔ لڑکے بالے کھانے سے فارغ ہو کر اپنی اپنی محبوباؤں کے ساتھ پنڈال میں اپنی اپنی جگہ لے رہے تھے۔ گور پریت میرے ساتھ ہی تھی۔ چند ہی منٹوں کے بعد میں گور پریت کو لے کر پاس کی پہاڑی پر پہنچ گیا۔ مختصر گفتگو کے بعد خاموشی ہی خاموشی میں ہم دونوں ان تمام حدود کو پھلانگ گئے جس کے لئے مہینوں بلکہ کبھی کبھی سالوں تک لگ جاتے ہیں اور پھر کبھی کبھی تو یہ چیز ممکن بھی نہیں ہو پاتی اور لامحالہ آدمی کو خودکشی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ مگر یہاں پر یہ سب کچھ چند ہی گھنٹوں میں اتنی آسانی سے ہو گیا کہ جیسے پہلے سے طے شدہ ہو۔

چونکہ میں دہلی سیر کرنے کی غرض سے آیا ہوا تھا۔ میرا کندرا کے روم کے علاوہ کوئی اور ٹھکانہ نہیں تھا۔ دوسرے میرے پاس پیسے بھی اتنے نہیں تھے۔ بابو جی معمولی سرکاری نوکری کرتے تھے۔ انہوں نے چلتے وقت جو پیسے دیئے تھے وہ اب ختم ہو چکے تھے یا پھر ختم ہونے کے قریب تھے۔ میں ایک وقت کھاتا تو ایک وقت فاقہ کشی کرتا اور دن بھر آوارہ گردی کرتا تھا۔

میرے برعکس گور پریت ایک آئی اے ایس افسر باپ کی بیٹی تھی اس کے پاس پیسے کی ریل پیل تھی لیکن اس کے ساتھ ایک مجبوری یہ تھی کہ وہ یہاں کی سٹوڈنٹ تھی۔ اسے باقاعدہ کلاس اٹینڈ کرنی پڑتی تھی۔اس لئے اس سے میرا ہر وقت مل پانا ممکن نہیں تھا۔

دوسری طرف پیسے کے معاملے میں ابھی اس سے اتنا فرینک بھی نہیں ہو پایا تھا کہ میں اپنی معاشی حالت کے بارے میں اسے بتاتا مگر یہ بات کب تک چھپی رہتی۔اس نے میرے بارے میں بہت کچھ میری مفلسانہ شکل وصورت سے ہی اندازہ لگالیا۔

اس سے میری تفصیلی ملاقات شام کو ہوتی تھی جب وہ اپنے ڈنر سے فارغ ہو کر کندرا کے ہوسٹل میں جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا آ جاتی ۔ پھر وہ مجھے اپنے ساتھ پاس کے ڈھابے پر لے جاتی اور میرے لئے اچھے سے اچھے کھانے کا آرڈر دیتی تھی اور جب تک میں کھانے میں مصروف رہتا وہ تب تک میرے برابر ہی بیٹھی رہتی اور جب میں کھانے سے فارغ ہو جاتا تو وہ اپنے پرس سے پیسے نکال کر بل کی ادائیگی کرتی اور پھر ہم وہیں سے پاس کی پہاڑی پر پہنچ جاتے اور رات بھر سگریٹ پھونکتے جو اس کے ہی پیسے کے خریدے ہوتے تھے اور پھر ہم ان تمام ہی طریقوں کو آزماتے جو ہم نے اپنے یار دوستوں سے سنے ہوئے ہوتے یا پھر تھری ایکس فلموں میں ہمارے دیکھے ہوئے ہوتے تھے۔

اس بیچ میں ہم ان احتیاطی تدابیر کو بھی نظر انداز کر دیتے جو کہ ایک غیر شادی شدہ جوڑے کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔وقت اتنی تیزی سے گذر جاتا کہ ہمیں پتہ بھی نہ چلتا۔ کبھی کبھی تو اتنی رات ہو جاتی تھی کہ ہم پہاڑی پر ہی ایک دوسرے سے لپٹ کر سو جاتے تھے۔یہاں تک کہ صبح ہو جاتی ۔ میں اس کو اپنے لئے بہتر ہی سمجھتا کیونکہ اتنی رات گئے کسی کے دروازہ کو کھٹکھٹانا میں کسی طور سے مناسب نہیں سمجھتا تھا۔

میرے شب وروز اس کے ساتھ اسی طرح گذرنے لگے میں نے بابوجی کو لکھ دیا کہ یہاں کا ماحول پڑھائی لکھائی کے لئے بہت سازگار ہے۔ یہاں جو کوئی بھی چند ایک

سال پڑھائی کر لے گا وہ آئی اے ایس و آئی پی ایس بن کر ہی نکلے گا اور چونکہ یہاں داخلہ کے لئے پہلے انٹرنس ٹیسٹ ہوتا ہے جس کی تیاری یہاں رہ کر ہی بہتر طریقے سے ہوسکتی ہے۔ جس میں میں ابھی سے لگ گیا ہوں۔ میں نے اپنے معمول کو اس طرح سے اور بھی زیادہ مضبوط کر لیا۔ ابھی کچھ ہی مہینے گذرے ہوں گے کہ پتاجی کا خط آیا کہ تمہاری ماتا جی کی طبیعت اچانک بہت زیادہ بگڑ گئی ہے خط کو تار سمجھو اور فوراً گھر پہنچو۔ ماں کی محبت میرے دامن گیر ہوئی۔ میں نے گھر جانے کی ٹھان لی۔

چونکہ میرا یہاں پر کوئی خاص ٹھکانہ نہیں تھا۔ لہذا میں نے اپنا مختصر سا سامان جس میں میرے زیادہ تر گندے کپڑے تھے گورپریت کے حوالے کر کے گھر کے لئے ٹرین پکڑ لی ابھی کچھ ہی دن گذرے ہوں گے کہ گورپریت کا میرے گھر خط آیا جس میں اور باتوں کے علاوہ اس نے لکھا کہ ''میں نے تمہارے کپڑے خود اپنے ہاتھوں سے دھوئے اور پھر پریس کئے سوائے ایک ''کیپری'' کے جس کو میں رات کو اپنے ساتھ لے کر سوتی ہوں اور جس میں میں تمہارے بدن کی خوشبو محسوس کرتی ہوں۔ آخر کب تک میں تمہاری اس کیپری کے سہارے اپنا وقت گزاروں۔ اب تو مجھے راتوں کو نیند بھی کم ہی آتی ہے۔ پچھلی رات عالم تخیل میں تمہاری اس کیپری کو اپنے ہاتھوں کی مٹھیوں میں کچھ اس طرح سے بھینچا کہ میری دونوں ہی ہتھیلیاں لہولہان ہوگئیں۔ تم جلدی آؤ'' وغیرہ وغیرہ۔

گورپریت کا خط چونکہ انگریزی میں تھا اور اتنی انگریزی نہ تو بابو جی کو آتی تھی اور نہ ہی آس پاس میں ہی کوئی ایسا شخص تھا اس لئے اس بات کا بھانڈہ پھوڑ نہیں ہو پایا۔ ادھر ماں کی طبیعت بھی کچھ سدھر چکی تھی۔ میں نے کچھ ہی دنوں میں پتاجی اور ماتا جی کو اچھے مستقبل کا جھانسہ دے کر پھر دہلی کا رخ کیا۔

میں نے جیسے ہی دہلی میں قدم رکھا گورپریت نے مجھے بتایا کہ سب کچھ تو اپنی جگہ ٹھیک ٹھاک ہی ہے مگر ایک خاص بات یہ ہے کہ میں حاملہ ہوگئی ہوں۔ چونکہ میں چھری

کانٹے سے بہت زیادہ ڈرتی ہوں اس لئے ایسا کرتے ہیں کہ ہم دونوں شادی کر لیتے ہیں۔
اس کی بات سن کر میرا وجود سُن سا ہو گیا۔ میں نے کہا۔ گور پریت ابھی تو میری مسیں بھی نہیں بھیگی ہیں تم کیا کہہ رہی ہو پھر میرے گھر والے کیا کہیں گے کہ کیا کرنے کے لئے گیا اور کیا کر کے آیا۔ یہ ممکن نہیں ہے۔ ادھر گور پریت کا پیٹ جوں جوں پھول رہا تھا اس کی گھبراہٹ توں توں بڑھ رہی تھی۔ میری طرف سے شادی کی تجویز کے رد ہونے کے بعد وہ چاہتی تھی کہ جلدی سے جلدی اس کا اسقاط حمل ہو جائے مگر مجھے اس طرح کے معاملات کا کوئی خاص تجربہ نہیں تھا۔ پھر مجھے اس نے خود ہی مالویہ نگر کے ایک نرسنگ ہوم کے بارے میں بتایا جہاں پر یہ سب کچھ ہوتا تھا اور ماضی میں اس کی کئی سہیلیاں یہاں پر آ کر اپنا اسقاط حمل کرا چکی تھیں۔ میں گور پریت کو لے کر وہاں پہنچا۔ ڈاکٹر نے پہلے جانچ پڑتال کی۔ گور پریت کا اندازہ بالکل صحیح تھا۔ ڈاکٹر نے فوراً آپریشن کی تیاری شروع کر دی۔ کاغذات وغیرہ پر میں نے ہی دستخط کئے۔

لیبر روم میں جاتے وقت گور پریت نے کچھ اس طرح بے بس نظروں سے میری طرف دیکھا کہ میں تھرا کے رہ گیا۔ پھر وہ کچھ ہی دیر میں باہر آ گئی۔ وہ نیم غنودگی کی حالت میں تھی۔ دو نرس اس کو دونوں طرف سے تھامے ہوئی تھیں اور پاس ہی پڑے بیڈ پر لٹا دیا۔ اس کی اس عجیب و غریب حالت کو دیکھ کر مجھے اس پر بڑا ترس آ رہا تھا۔ معصومیت اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ میں کافی دیر تک اس کے بالوں میں اپنے ہاتھوں کی انگلیوں سے کنگھی کرتا رہا۔

گور پریت کو چونکہ آرام کی ضرورت تھی اس لئے ایک دو روز کے لئے وہ مالویہ نگر میں ہی اپنی ایک مقامی سہیلی کے یہاں رک گئی اور میں واپس یونیورسٹی آ گیا۔ ایک دو روز کے بعد جب گور پریت یونیورسٹی پہنچی تو میری اس سے ملاقات ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ اب ملاقات میں اس کی طرف سے وہ گرمجوشی نہیں رہی۔ میری حسب دستور شام

کواس سے ملاقات ہوتی وہ پہلے کی طرح مجھے ڈھابے پر کھانا کھلانے بھی لے جاتی اور بل بھی اپنے پرس سے ادا کرتی۔ مگراب وہ فوراًوہیں سے اپنے ہوسٹل چلی جاتی۔ میرے لئے اس کے بغیر رات کا بقیہ حصہ گزارنا مشکل ہو جاتا تھا۔ مجھے تنہائی کاٹنے کو دوڑتی تھی۔

اسی بیچ میرا داخلہ دہلی یونیورسٹی میں ہوگیا۔ مجھے وہاں پر ہوسٹل میں جگہ نہیں مل پائی تلاش بسیار کے بعد مجھے کندرا کے ہوسٹل کے پاس ہی ایک فورتھ گریڈ کے ملازم کے یہاں ایک روم مل گیا۔ یہ فلیٹ اس کو یونیورسٹی کی طرف سے ملا ہوا تھا۔ پیسے کی تنگی کی وجہ سے اس میں سے ایک روم اس نے مجھے کرائے پر دے دیا۔

بوڑھا رات بھر ڈیوٹی پر ہوتا صبح کو کس وقت گھر آتا اور کس وقت ڈیوٹی پر جاتا مجھے پتہ بھی نہیں چلتا۔ کیونکہ کلاس کے علاوہ میں نے اب ایک پارٹ ٹائم جاب بھی کرلی تھی۔ اس میں بھی میرا کچھ وقت لگ جاتا۔

بوڑھے کے علاوہ گھر کے چار اور دیگر ممبران تھے۔ اس کے بڑے لڑکے کی شادی ہو چکی تھی۔ جو اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ کہیں اور کمرہ لے کر رہ رہا تھا۔ اس کے علاوہ آنٹی اوران کی دو بیٹیاں تھیں۔ آنٹی بڑی ہی کھلی طبیعت کی تھیں وہ چاہتی تھیں کہ ان کی لڑکیاں میرے ساتھ کھائیں کھیلیں۔ مگر چھوٹی لڑکی جو انٹر میں پڑھتی تھی بڑی خرانٹ قسم کی تھی۔ اس کو مجھ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ سکول کے علاوہ باقی وقت میں کتابیں لئے بیٹھی رہتی یا پھر ٹی وی دیکھنے میں وقت گزارتی۔

بڑی والی لڑکی کو میں نے کچھ ہی دنوں میں بہت حد تک شیشے میں اتارلیا اس کی دنیا عام طور پر باورچی خانہ تک محدود رہتی وہ جب بھی کوئی نئی ڈش بناتی تو اپنے بقیہ افرادخانہ کی نظروں سے بچ بچا کر کچھ نہ کچھ میری طرف بڑھا دیا کرتی۔ قبل اس کے کہ معاملہ کچھ آگے بڑھتا اسی بیچ میں میری کلاس کی ہی ایک لڑکی جس کا نام ریتا تھا مجھے اپنا دل دے بیٹھی۔ وہ گور پریت کی طرح پیسے والی تو نہیں تھی مگر میرے مقابلے میں اس کی مالی حالت

ضرور بہتر تھی۔ اس نے اپنی کئی سہیلیوں کو میرے آگے پیچھے لگا رکھا تھا کہ میں اس کے بارے میں اپنے احساسات کا اظہار کروں مگر اس نے میری خاموشی کا ایک الگ ہی مطلب نکال لیا۔ چونکہ اس کا گھر اسی علاقے میں واقع تھا جہاں میں نے روم کرائے پر لے رکھا تھا۔ کلاس ختم ہونے کے بعد وہ اکثر و بیشتر میرے ساتھ ہی میرے روم میں آ جاتی۔ بوڑھے نے جو مجھے روم کرایہ پر دے رکھا تھا۔ وہ چونکہ فلیٹ کے عین درمیان واقع تھا۔ اس لئے روم کے آس پاس ہر وقت اس کے گھر کا کوئی نہ کوئی فرد ضرور ہوتا۔ ایسی حالت میں میں روم کو پورے طور سے بند کرنا بھی مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ میں ادھ کھلے روم میں ہی ریتا کے ساتھ سویا پڑا رہتا۔ یہ الگ بات ہے کہ بڑے بڑے شہروں میں سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی دخل در معقولات اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ ریتا کی جسمانی تبدیلیوں سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں بالکل دیر نہیں لگی کہ یہ کافی کچھ کھائی کھیلی ہوئی لڑکی ہے۔ جب ہم لوگ روم سے باہر نکلتے تو مالک مکان کی لڑکیاں چور نگاہوں سے ہمیں دیکھا کرتیں۔

ادھر میں اپنی پڑھائی، جاب و ریتا کے چکر میں کچھ اس طرح پھنس گیا کہ میں نے ہوسٹل جانا یک دم موقوف کر دیا۔ اب میری گور پریت سے کم ہی ملاقات ہوتی۔ اس بیچ مجھے پتہ چلا کہ گور پریت نے شادی کر لی ہے اور ایسی شادی جس میں دولہا دلہن کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا کیونکہ یہ ایک کورٹ میرج تھی۔

ایک روز جب میں ریتا کو اپنے روم سے رخصت کرنے کے بعد اپنی بوریت کو دور کرنے کے لئے ہوسٹل کے ڈھابے پر پہنچا تو مجھے وہاں پر گور پریت ایک لڑکے کے ساتھ نظر آئی۔ اس کی مانگ میں سندور ضرور تھا مگر وہ کچھ زیادہ ہی کشیدہ موڈ میں تھی۔ مجھے کسی نے کان میں بتایا کہ یہ وہی لڑکا ہے جس سے گور پریت نے شادی کی ہے۔ لڑکے کا چہرہ گول مٹول اور بال بڑے لمبے لمبے تھے وہ کچھ زیادہ ہی خوش نظر آ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ گور پریت نے خود ہی اپنے پرس سے پیسے نکال کر بل کی ادائیگی کی۔

☆☆

# اپینڈس

رگھوناتھ کلکرنی کو دہلی آنے کے لئے برونی ایکسپریس پکڑنی تھی جس کی روانگی کا وقت مظفر پور سے صبح ۶ بجے کے قریب تھا۔ چونکہ کلکرنی کا گھر بہار کے ایک دور افتادہ علاقے میں واقع ہوا تھا۔ اس لئے صبح ہی صبح مظفر پور پہنچ کر برونی ایکسپریس پکڑنا اس کے لئے ناممکن تھا۔ چنانچہ وہ ایک روز پہلے ہی مظفر پور ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گیا اس کے پاس ابھی کافی وقت تھا اور اسٹیشن کے تھرڈ کلاس ویٹنگ ہال کی مکدر فضا میں جہاں بھانت بھانت کے لوگ بینچ کے فل ہوجانے کے بعد فرش پر ہی لیٹے پڑے تھے۔ ان کے بیچ میں رات گزارنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔

پچھلی بار جب وہ دہلی آنے کے لئے اسٹیشن پر پہنچا تو اسے اسٹیشن کے ہی ویٹنگ ہال میں رات گزارنی پڑی تھی۔ جہاں پر اسے عجیب وغریب تجربے سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ کوئی چلم میں بھنگ ڈال رہا ہے تو کوئی تمباکو اپنی ہتھیلیوں پر رگڑ رہا ہے تو کوئی اُسے اپنے ہونٹوں میں دبا رہا ہے، کوئی سونے کی کوشش کر رہا ہے تو کوئی نیند میں سمع خراش خراٹے لے رہا ہے۔ کسی لڑکی کا جمپر سے بے نیاز پیٹ دعوت نظارہ دے رہا ہے تو کوئی عورت اپنے بچے کو دودھ پلاتے پلاتے سوگئی ہے۔ اب بچہ ایک طرف کو لڑھک گیا ہے تو دوسری طرف اس کی چھاتیاں جوں کی توں کھلی رہ گئی ہیں۔

اسی بیچ ایک بھکاری جو پاس ہی بیٹھا بریانی کا نوالہ مزے لے لے کر اپنے حلق

کے نیچے اتار رہا تھا۔ بریانی کا کچھ حصّہ اپنے ساتھی بھکاری کی طرف بڑھاتے ہوئے اس سے الجھ پڑتا ہے۔

''سالے!..... میں دیکھ رہا ہوں تو پندرہ سال سے بھیک مانگ رہا ہے مگر روٹی کھانے کے لئے تیرے پاس برتن کے نام پر ایک مٹی کا پیالہ تک نہیں ہے۔ تو، تو دھوتی میرے ہی لٹکائے پھرتا ہے۔ تیرے پاؤں میں چپل تک نہیں..... تیرے ہی جیسے چور اس پیشے کے ماتھے پر کلنک ہیں..... آخر کب تک میں تمہارا بوجھ اٹھائے پھروں..... میرے بھی تو بال بچے ہیں..... جو میری راہ تکتے ہیں.....''

پچھلی بار کا سارا منظر کلکرنی کی نظروں کے سامنے ایک ایک کر کے گردش کرنے لگا۔ اسے اسٹیشن پر رکنے کے تصور سے ہی کوفت ہو رہی تھی۔ چنانچہ اس مرتبہ وہ رات اسٹیشن کے ویٹنگ ہال میں ان غلیظ لوگوں کے بیچ میں گزارنے کی بجائے اپنے سامان کو اسٹیشن کے لاکر میں جمع کروا کر اسٹیشن کے عین سامنے والی سڑک پر آ گیا اس نے اپنے دوستوں سے یہاں کے ''چتر بھج استھان'' کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اس نے موقع کو غنیمت جانا اور وہاں جانے کا ارادہ کر لیا۔ اس نے کچھ شرماتے، لجاتے کچھ اپنے اوپر مصنوعی سنجیدگی لاتے ہوئے ایک ظاہراً بے وقوف رکشے والے سے جس کے سر پر بال کے نام پر صرف پیچھے کو ایک چٹیا سی لٹک رہی تھی۔ بدن پر بغیر کالر کی جیب دار بنیان۔ دھوتی اگرچہ کافی پرانی لگ رہی تھی مگر اس کے کنارے کو بڑے ہی کلاسیکل انداز میں پیچھے سے اندر کو ڈالے ہوا تھا۔ پاؤں میں پلاسٹک کا معمولی سا جوتا تھا جس کو عام طور سے لوگ برسات کے موسم میں پہنتے ہیں۔

کلکرنی بڑی ہی دھیمی آواز میں اس سے مخاطب ہوا۔

''رکشا والے..... او رکشا والے..... چلنا ہے.....''

''کہاں!..... بابو جی.....''

''چ.....چ.....ت.....ر.....ر.....''

''کیا کہا؟.....بابو جی.....''

کلکرنی نے پہلے تو ایک دوبار کھانس کر گلے کو صاف کیا۔ پھر بولا۔

''چتر بھج استھان.....''

''کیوں نہیں بابو جی!.....ضرور جائیں گے.....''

کلکرنی کو اندر ہی اندر گھبراہٹ ہو رہی تھی کہ کہیں اس کی باتوں کو کوئی اور تو نہیں سن رہا ہے۔

تھوڑے مول بھاؤ کے بعد کرایہ طے ہو گیا اور پھر وہ فوراً ہی رکشے پر سوار ہو کر چتر بھج استھان کے لئے روانہ ہو گیا۔ ابھی کوئی آدھ پون گھنٹہ ہی گزرا ہوگا کہ چتر بھج استھان آ گیا۔ کلکرنی رکشے سے اتر کر نیچے کھڑا ہو گیا۔ کرایہ ادا کیا۔ رکشا والے نے کلکرنی پر ایک نظر ڈالی جس میں افسوس کے ساتھ ساتھ پشیمانی بھی شامل تھی۔ وہ کلکرنی کو کچھ ٹپس دینے لگا۔

''بابو جی!.....شاید آپ کو پتہ نہ ہو.....یہاں بڑی لوٹ کھسوٹ ہوتی ہے۔ بھڑوے اڑوے کے چکر میں مت پڑیئے گا ورنہ لٹ جایئے گا.....جو پیسے آپ کو یہاں خرچ کرنے ہیں اُن کو بقیہ پیسوں سے الگ رکھئے گا۔۔ شاید آپ کو آگے بھی سفر کرنا ہو.....''

کلکرنی نے کچھ شرماتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''اب کدھر کو جانا ہے.....''

''اس نے ہاتھوں کے اشارے سے بتایا کہ یہ پورا علاقہ ہی ہے۔ آپ خود ہی گھوم پھر کر دیکھ لیجئے اور جہاں پر بہتر لگے.....''

کلکرنی اس کو اپنی واپسی تک وہیں رکنے کا اشارہ کر کے ایک انجانی ڈگر پر چل پڑا۔ شام کافی ہو چکی تھی۔ کہیں دکانوں پر جلیبیاں بن رہی تھیں تو کہیں پوریاں وسموسے تلے

جا رہے تھے۔لوگ کھانے پینے میں لگے ہوئے تھے۔نوجوان چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں گھوم رہے تھے۔

پاؤڈر ولپ سٹک سے لپی پوتی ادھیڑ عمر کی عورتیں اور جوان و نوعمر لڑکیاں اپنے اپنے کمرے کے باہر کھڑی ہو کر گاہکوں کو اشارے سے اپنی طرف بلا رہی تھیں۔بھڑوے نو واردوں کے پیچھے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

''صاحب!..... میرے پاس نیپالی بھی ہے..... تو صاحب؟..... میرے پاس..... وغیرہ وغیرہ۔''

گھروں میں تیز آواز میں ٹیپ ریکارڈر بج رہے تھے تو کہیں میوزک کی تھاپ پر لڑکیاں ڈانس کر رہی تھیں۔کہیں سارنگیئے تان کسے ہوئے تھے۔

کلکرنی ابھی انہی نظاروں میں اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا کہ اچانک اُسے ایک الگ تھلگ پڑی بلڈنگ کی فرسٹ فلور پر دو لڑکیاں نظر آئیں۔ان میں سے ایک نے اپنے ہاتھوں کے اشارے سے کلکرنی کو اوپر آنے کا اشارہ کیا جواباً اس نے اپنی آنکھوں کے اشارے سے اسے نیچے بلایا۔ان کی عمریں یہی کوئی ۱۴۔۱۶ کے بیچ میں رہی ہونگی۔آپس میں کچھ کھسر پھسر ہوئی اور پھر دوسرے ہی لمحہ کلکرنی ان دونوں کی معیت میں بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ناکافی صفائی کی وجہ سے سیڑھیوں پر گرد و غبار منجمد ہو کر چھوٹے چھوٹے ٹیلے کی شکل اختیار کر چکے تھے جو آنے جانے والوں کی رفتار میں رکاوٹ بن رہے تھے۔

کلکرنی اوپر پہنچ کر جیسے ہی ایک کمرے میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ کمرے میں سٹوو بڑی تیزی سے جل رہا ہے اور ایک ادھیڑ عمر کی عورت اس پر رکھی دیگچی میں کچھ ڈالے ہوئے یکلخت چمچے سے چلائے جا رہی ہے اور اس کے ارد گرد ۴۔۵ مرد بیٹھے ہوئے تھے جو غالباً بھنگ یا شراب کا نشہ کرنے میں مشغول تھے اور چلا چلا کر آپس میں کچھ ایسی باتیں کر رہے تھے جو کلکرنی کی سمجھ سے باہر تھیں۔ان لوگوں پر اچٹتی نظر ڈالتے ہوئے ان

لڑکیوں کے ساتھ آگے اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جو اسی مین کمرے کے اندر ہی آخری سرے پر کچی دیوار ڈال کر الگ تھلگ بنایا گیا تھا۔ کمرے کے گیٹ پر دروازے کی بجائے ہلکے کپڑے کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ کمرہ بڑا ہی بے رونق سا تھا۔ فرش پر کچھ سگریٹ و بیڑیوں کے مسلے ہوئے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ جو لوگوں کی آمد کی اطلاع دے رہے تھے۔ کمرے کے ایک طرف ایک پلنگ تھا جس پر ایک میلی کچیلی سی چادر بچھی ہوئی تھی کمرے میں کوئی ایسی ویسی چیزیں جو عام طور پر کمروں کی زینت بڑھانے کے لئے رکھی جاتی ہیں نہیں تھیں۔

چھوٹی لڑکی اب وہاں سے کھسک گئی۔ بڑی لڑکی نے دروازے کے پردے کو اپنے ہاتھوں سے برابر کیا اور پھر کلکرنی کے پہلو میں آ کر بیٹھ گئی۔ اس کی رنگت سانولی تھی۔ اس کے کھلے ہوئے لمبے لمبے بال کمر تک پھیلے ہوئے تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی، گہری و سیاہ تھیں، وہ ڈھیلی ڈھالی شلوار، بہت ہی تنگ قمیص زیب تن کئے ہوئے تھی۔ جس میں اس کی چھاتیوں کے ابھار کا صاف اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

چھوٹی لڑکی اب کلکرنی کی تواضع کرنے لگی، وہ کبھی اس سے پانی کو پوچھتی تو کبھی کولڈ ڈرنک کو، کبھی ناشتے کو، تو کبھی کھانے کو۔

اجنبی مہمان کی آمد کی خوشی ان دونوں کی آنکھوں سے جھلک رہی تھی۔ ابھی کچھ بات چیت کا سلسلہ شروع ہی ہوا تھا کہ اچانک لائٹ چلی گئی۔ کلکرنی کو گھبراہٹ سی محسوس ہوئی وہ بستر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کمرے کا دوسرا دروازہ جو بالکونی کی طرف کھلتا تھا اس طرف بڑھا، لڑکی گھبرا گئی۔ وہ بولی۔

''بابو جی!..... ادھر مت جایئے..... ادھر میری بھابیوں کے کمروں کی بالکونیاں کھلتی ہیں اس وقت وہ اپنی بالکونیوں میں ہی ہونگی..... ایک اجنبی آدمی کو میری بالکونی میں دیکھیں گی تو یہی سوچیں گی..... کہ لو اب شنو نے بھی دھندا شروع کر دیا اور خدا نخواستہ میرے بھائیوں میں سے کسی کو آپ کی آہٹ بھی مل گئی تو...... آپ مشکل میں پڑ سکتے

ہیں......"

اسی بیچ چھوٹی لڑکی موم بتی جلا کر اندر لے آئی۔ کلکرنی کو کچھ جان میں جان آئی۔ پھر کچھ ہی دیر میں لائٹ آ گئی۔ کلکرنی کی دہشت کچھ کم ہوئی۔ بڑی لڑکی پھر اس کے بغل میں آ کر بیٹھ گئی۔

ابھی چند منٹ ہی گزرے ہونگے کہ سیڑھیوں پر سے کسی بوڑھے کی زناٹے دار آواز آنے لگی۔

"شنو!.....اے شنو!..... 'اور پھر آواز کے ساتھ ہی وہ بوڑھا باہری کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔

بڑی لڑکی جواب تک کلکرنی کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی اچانک کھڑی ہو گئی اور پردے کے باہر منہ نکال کر سٹوو کے پاس بیٹھی عورت سے مخاطب ہوئی۔

"اے ممی.....اے ممی....."

"کیا بات ہے بیٹی؟....."

"پاپا کو بول کے.....وہ باہر جائیں.....مجھے ان کی موجودگی میں اچھا نہیں لگتا ہے....."

"تو جا.....اسے نپٹا.....میں بڈھے کو باہر بھیجتی ہوں....."

پھر فوراً ہی عورت نے بوڑھے کو ہنکار لگائی۔

"شنو کے پاپا.....سنتے ہو....."

"کیا بات ہے؟....."

"یہاں بیٹھ کر کیا کرو گے؟.....لالہ کی دکان پر جاؤ....."

"اس وقت کیا کام آن پڑا....."

"کل کے لئے.....آٹا نمک.....پھر درجنوں چیزوں کے نام اس نے گنوا

ڈالے.....''

''اچھا جاتا ہوں..... پیسے لاؤ.....''

''یہ لو.....''

پھر فوراً ہی بڈھا یہ جا وہ جا ہو گیا۔ لڑکی پھر کلکرنی کے پہلو میں آ کر بیٹھ گئی۔

''بابو جی!..... آپ کہاں سے آئے ہیں؟.....''

''یہیں پاس ہی میں ایک گاؤں ہے.....''

''کیا نام ہے؟.....''

''رہنے دو.....'

''نہیں نہیں.....بتائیے نا.....''

''گھ گھ..... گھامڑ نگر.....''

''گھامڑ نگر.....''

''ہاں.....''

''تو آپ پنڈت شیامل مکر جی کو جانتے ہونگے.....''

''پ پ پ..... پنڈت جی!..... ان کو کون نہیں جانتا..... شادی.....بیاہ، کریا کرم..... کون سا ایسا متبرک موقع نہیں ہے جس پر اُن کو یاد نہ کیا جاتا ہو.....''

''کوئی ہفتہ ایسا نہیں گزرتا ہے جس میں وہ یہاں نہ آتے ہوں.....''

''اچھا!..... تو پنڈت جی بھی.....''

''پاپا کے دوست ہیں..... پچھلی بار جب وہ یہاں آئے تھے تو بارش نے اتنا طول پکڑا کہ ان کو پوری رات یہیں گزارنی پڑی.....''

پنڈت جی کا نام سُن کر کلکرنی تھوڑا اٹھکا۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ لڑکی نے سکوت کو توڑا۔

''بابو جی!..... پاپا آنے والے ہیں.....''

''کیا دکان پاس ہی میں ہے.....''

''اسی بلڈنگ کے نیچے ہے..... مجھے پیسے دیجئے اور اپنا.....''

''ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے..... ابھی دیتا ہوں.....'

''میری بات کا بُرا مت مانئے گا۔۔۔''

''بالکل نہیں.....''

''شام ہوتے ہی یہ علاقہ چورا چکوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ شریف آدمیوں کا گھر سے باہر قدم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ کو کوئی.....'' لڑکی نے بات کو مزید آگے بڑھایا۔

کلکرنی نے کچھ روپے جو اس نے بقیہ روپوں سے الگ رکھ چھوڑے تھے اسے پرس میں سے نکال کر لڑکی کی طرف بڑھائے۔

لڑکی نے بیٹھے ہی بیٹھے ان روپوں کو اپنی دونوں چھاتیوں کے بیچ میں دبالیا۔

''بابو جی!..... آپ سوچتے ہونگے کہ میں کوئی پیشہ ور.....''

''نہیں نہیں..... میں ایسا بالکل نہیں سوچتا.....''

''میرے ساتھ ایک بہت بڑی مجبوری ہے.....''

''مجبوری؟..... کیسی مجبوری؟.....''

''میں اپینڈس جیسی نامراد بیماری میں مبتلا ہوں.....''

''ہاں..... یہ تو بڑا موذی مرض ہے..... اگر فوراً ہی آپریشن نہ ہوا تو آدمی کی جان بھی جا سکتی ہے.....''

اور پھر فوراً ہی وہ اپنے بائیں ہاتھ سے قمیص کا ایک سرا تھوڑا اوپر کو اٹھا کر داہنے ہاتھ سے اپنی شلوار کو نیچے کی طرف کھسکاتی ہے اور پھر ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک جگہ ٹکا کر

کلکرنی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

''بابو جی!..... یہ ہے.....''

''ڈاکٹر کو دکھایا ہے؟.....''

''دکھایا ہے.....''

''کیا بولا.....''

''بولتا ہے آپریشن ہوگا..... پورے دس ہزار لگیں گے.....''

''بابو جی!..... قسم اوپر والے کی میں ان روپوں کو پاؤڈر ولپ سٹک پر خرچ نہیں..... کروں گی..... بلکہ.....''

''اپینڈس'' کا نام سُن کر کلکرنی تھوڑا اتھرا سا جاتا ہے۔ اس کے اوپر ہیبت سی طاری ہو جاتی ہے۔ کبھی وہ اپنے پاس بیٹھی لڑکی پر نظر ڈالتا ہے، تو کبھی اپنے منتشر حواس کو مجتمع کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جواب تاش کے پتوں کی طرح بکھر چکے ہیں۔ کلکرنی معاملے کو جلد سے جلد نپٹا کر اب یہاں سے باہر نکل کر کھلی ہوئی فضا میں لمبی لمبی سانسیں لینا چاہتا ہے۔

''بابو جی!..... آپ کچھ پریشان سے لگ رہے ہیں..... میں آپ کی کچھ مدد کروں.....''

''کیوں نہیں؟..... ادھر آؤ..... اس طرف.....''

''اوئی..... اوئی..... بس..... بس..... رہنے دو.....''

اور پھر کلکرنی پہلے ہی..... اس کا سارا وجود پسینے سے تر بتر ہو گیا۔ وہ خجالت سے اس سے نظریں بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''بابو جی!..... میرا کوئی قصور نہیں ہے.....''

لڑکی کو لگ رہا تھا جیسے کہ اس سے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہو..... وہ کلکرنی سے کہیں

زیادہ شرمسار تھی۔

کلکرنی نے جلدی جلدی اپنے کپڑے درست کیے، ہاتھوں کی انگلیوں سے اپنے بالوں میں کنگھی کی اور اپنی الٹی سیدھی سانسوں کو ترتیب دیتا ہوا وہاں سے نکل پڑا۔

چھوٹی لڑکی گیٹ کے پاس کھڑی تھی۔ باہری کمرے میں شرابیوں کا شور جوں کا توں برپا تھا۔

کلکرنی اب سیڑھیوں پر قدم رکھ چکا تھا۔ سیڑھیوں پر اس کا باپ جو سودا سلف سے لدا پھدا ہوا تھا اس سے ٹکرایا۔ پھر وہ دوسرے ہی لمحے نیچے تھا۔ قبل اس کے کہ وہ لمبی ڈگ بھر کر بھیڑ میں گم ہو جاتا۔ چھوٹی لڑکی کی اوپر سے بڑی تیز آواز آئی۔

''بابو جی!...... آپ کا پرس...... وہ وہیں کمرے میں پیسہ دیتے وقت چھوٹ گیا تھا کو لے کر نیچے آ رہی تھی۔ اس سے پرس لے کر کلکرنی نے جیب میں ڈال لیا اور جب اس نے اوپر نظر اٹھائی تو اس نے بڑی لڑکی کو بالکونی میں کھڑی پایا۔ جواب بھی بڑی افسردہ اور شرمساری نظر آ رہی تھی۔ کلکرنی بڑی تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ وہیں پاس ہی اس کا رکشا والا تھا جو اس کا انتظار کر کے رکشے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا اونگھ رہا تھا۔ کلکرنی کو اچانک اپنے پاس پا کر چونک پڑا۔ اس نے کلکرنی کے سراپے پر ایک نظر ڈالی۔ کلکرنی کو ایسا لگا کہ جیسے وہ اپنی نگاہوں کے ترازو میں اسے تولنے کی کوشش کر رہا ہو اور وہ اس سے نظریں بچا رہا ہو۔

☆☆☆☆
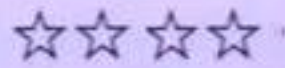
# آشیرواد

میراثی۔وی ٹرانسمیشن ایگزیکٹو کی پوسٹ کے لئے محکمہ انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ میں انٹرویو تھا۔میں کسی بھی حالت میں ۹ بجے سے پہلے دہلی پہنچ جانا چاہتا تھا۔ یہاں کی جسم وجان کو تھکا دینے والی ڈیوٹی سے فارغ ہونے کے بعد جب میں ریلوے سٹیشن پر پہنچا تو ٹاٹا موری کے جانے کے بعد سٹیشن پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔اب جموں میل کو آنا تھا جس پر میں سوار ہو سکتا تھا۔اس کے بعد گولڈن ٹیمپل میل آتی جس پر سوار ہونے کے تصور سے ہی مجھے پسینہ آ رہا تھا۔کیونکہ اکا دُکا ڈبوں کے علاوہ اس میں تمام ہی ڈبے ریزو ہوتے ہیں اور میرے پاس ریزرویشن تھا نہیں۔۱۰ بجے کے قریب جموں میل آ گئی۔ریزرویشن والے اکثر ڈبے بند تھے۔میں یہ سوچ رہا تھا کہ ٹی ٹی ای کو تھوڑے بہت پیسے دے کر دہلی پہنچ جاؤں گا۔ ان ڈبوں میں اکثر مسافر سوئے پڑے تھے۔لاکھ کوششوں کے باوجود کسی نے دروازے نہیں کھولے اور میں تھک ہار کر ایک جنرل کمپارٹمنٹ میں جو میرے پاس ہی میں تھا داخل ہو گیا۔معمول کے برعکس ڈبے میں کچھ زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔گنے چنے ہی لوگ تھے جو نیند کی شدّت سے اونگھ رہے تھے اور بیٹھے ہی بیٹھے ایک دوسرے پر گر رہے تھے۔میں نے اِدھر اُدھر کئی برتھوں پر نظر ڈالی اور پھر ایک برتھ جس پر دو تین آدمی پہلے ہی سے براجمان تھے اسی پر بیٹھ گیا۔سفری بیگ کو کھڑکی کے پاس لگے ہک سے لٹکایا اور پھر اپنے ہوش وحواس درست کیے۔تھوڑا اطمینان ہوا تو سامنے والی برتھ پر نظر ڈالی جس پر تین مسافر بیٹھے ہوئے تھے جس

میں ایک لڑکا اور دو لڑکیاں تھیں، لڑکا دونوں لڑکیوں کے بیچ میں بیٹھا ہوا تھا بلکہ بائیں سائڈ والی لڑکی کے کچھ زیادہ ہی قریب تھا۔ ان دونوں نے ایک معمولی و تنگ سی شال اپنے اوپر ڈال رکھی تھی جو ان کے اوپری حصے کو ڈھانپنے میں بھی ناکافی ثابت ہو رہی تھی۔ لڑکی نے جینز اور تنگ ٹاپ پہن رکھا تھا۔ جب کبھی بھی اس کے بدن میں حرکت ہوتی تو اس کا جینز و ٹاپ کے بیچ کا حصہ بلب کی مدھم و ملگجی روشنی میں لمحے بھر کے لئے کندن کی طرح دمک جاتا تھا۔ آس پاس کے لوگوں سے بے نیاز دونوں ایک دوسرے سے جونک کی طرح چپکے ہوئے تھے۔

اوپری حصے کے ڈھکے ہونے کی وجہ سے صاف تو نہیں مگر ایسا لگ رہا تھا کہ لڑکے کا دایاں ہاتھ لڑکی کی ٹاپ کے اندر ہے۔

اچانک میری نظروں کے سامنے اپنا ایک پرانا واقعہ گھوم گیا جب میں سوتنتر تا سینانی ایکسپریس سے گھر سے دہلی کو آ رہا تھا۔ رات کافی ہو چکی تھی، کمپارٹمنٹ کے اندر اکثر لوگ سو چکے تھے یا سونے کی کوشش کر رہے تھے کہ اچانک ٹرین ایک لمحے کو کسی سٹیشن پر رُکی۔ پھر میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک ادھیڑ عمر کی عورت ایک نوعمر لڑکی کے ساتھ میرے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئی۔ اس نے بیٹھنے کے لئے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں لیکن کہیں جگہ نظر نہیں آئی تو پھر وہ دونوں میری طرف متوجہ ہوئیں۔ میں سائڈ والی سیٹ پر نیم غنودگی کی حالت میں لیٹا ہوا تھا۔ غیر ارادی طور پر میں نے اپنے دونوں پاؤں سمیٹ لئے وہ دونوں میری ہی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئیں۔ مگر تنگی کی وجہ سے کچھ دیر بعد ہی عورت، لڑکی کو اوپر ہی بیٹھے رہنے کا اشارہ کر کے خود نیچے بیٹھ گئی۔ میں نے لڑکی کے ذہن کو ٹٹولنے کے لئے اپنے داہنے ہاتھ کی انگلیاں اس کی کمر سے ٹکا دیں۔ اس نے بغیر کسی مزاحمت کے ہی اپنی گرم گرم مٹھیوں میں میری انگلیوں کو بھینچ لیا۔ پھر اس نے خود ہی دوپٹے کی آڑ میں میری انگلیوں کو ان ان جگہوں کی زیارت کروائی کہ توبہ ہی بھلی۔

داہنے سائڈ والی لڑکی ان دونوں سے بے نیاز الگ تھلگ کھڑکی سے ٹیک لگائے اونگھ رہی تھی۔ اس نے پنجابی شلوار اور قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ نیند میں بڑی بے چارگی سے اپنے پاؤں کو میری برتھ سے ٹکانے کی کوشش کرتی اور اُس کے پاؤں تھے کہ کچھ ہی دیر میں نیچے لڑھک جاتے۔ شلوار ڈھیلی ہونے سے اس کے پاؤں گھٹنے تک کھل جاتے تھے۔ اس مرتبہ جب اس نے اپنے پاؤں میری برتھ کی طرف بڑھائے تو میں نے یکبارگی اس کے دونوں پاؤں اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لئے۔ لڑکی نے اپنی آنکھیں کھولیں اور وہ بغور مجھے دیکھنے لگی میں نے غنودگی ظاہر کرتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اس نے اپنے پاؤں کو میری گود میں ہی رہنے دیا۔ میں اپنے ہاتھوں سے اس کے پاؤں کے تلوے سہلانے لگا۔ اس دوران جب بھی میں اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو اس کے پاؤں کی انگلیوں کے بیچ ڈالتا تو اس کے تن بدن میں برقی لہر سی دوڑ جاتی اور پھر وہ لمحہ بھر کے لئے اپنی آنکھیں کھول دیتی اور فوراً بند کرلیتی۔ اس کے دونوں پاؤں دودھ کی طرح سفید تھے۔ میری خواہش ہوتی تھی کہ میں اس کے ان دونوں پاؤں کو اپنے ہونٹوں سے چوموں اپنی زبان سے چاٹوں اور پھر اپنے لعاب دہن سے تربتر کردوں۔ یہ سلسلہ وقفہ وقفہ سے تقریباً ساری رات چلتا رہا۔

ٹرین اب دہلی پہنچنے کو تھی، لوگ بیدار ہو رہے تھے۔ کچھ قضائے حاجت کے لئے ٹائلٹ کی طرف جا رہے تھے، تو کچھ اپنے سامان کو ٹھیک کر رہے تھے، تو کچھ انگلیوں سے اپنے حلیوں کو درست کر رہے تھے۔

اس آپا دھاپی میں میرے سامنے والی سیٹ پر بیٹھے لڑکے اور لڑکیوں نے بھی اپنی آنکھیں کھول دیں اور سنبھل کر بیٹھ گئے اور پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''دہلی ابھی کتنی دور ہے؟.....''

''بس آنے ہی والی ہے.....''

پھر ہم لوگ خاموشی سے بیٹھ کر دہلی کا انتظار کرنے لگے۔ میرے استفسار پر

داہنے سائڈ والی لڑکی نے بتایا۔

''ہم سرائے خلیل میں رہتے ہیں اور جموں سے ماتا ویشنو دیوی کے درشن کر کے آ رہے ہیں۔''

پھر اچانک ہی پرانی دہلی کا ریلوے سٹیشن آ گیا اور ہم سب نے ٹرین سے اتر کر اپنی اپنی راہ لی۔

دہلی میں اترنے کے بعد میں انٹرویو کے لئے محکمہ انفارمیشن و براڈ کاسٹنگ میں پہنچا تو مجھے پتہ چلا کہ انٹرویو کسی وجہ سے ملتوی ہو چکا ہے اور چونکہ میری درخواست پر فون نمبر نہیں تھا اس وجہ سے فی الفور مجھے صورت حال سے مطلع نہیں کیا جا سکا۔ میں مایوس ہو کر جالندھر لوٹ آیا۔

اگلی تاریخ پر پھر میں دہلی پہنچا اور میرا انٹرویو بھی ہوا، انٹرویو سے فارغ ہونے کے بعد میرا ارادہ اپنے دوست ستیش سے ملنے کا ہوا۔ جو ان دنوں محلہ نیاران میں اپنی پرائیویٹ کلینک کھولے ہوئے تھا۔ ٹرین کے آنے میں ابھی کافی وقت تھا۔ میں نے تھری وہیلر کو اجمیری گیٹ پر ہی چھوڑ دیا۔ محلہ نیاران جی بی روڈ کو کراس کر کے جایا جاتا ہے جب میں کوٹھا نمبر ۶۷ کے پاس سے گزرا تو مجھے کوٹھے کے پاس سیڑھی کے بالکل نزدیک وہی لڑکی نظر آئی جس کے پاؤں سے میں ٹرین میں رات بھر کھیلتا رہا تھا۔ پہلے تو میں ذرا جھینپا۔ میرے بغور دیکھنے پر وہ لڑکی خود ہی بول پڑی۔

''بھائی صاحب؟..... آپ جموں میل میں.....''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ہاں!..... ہم لوگ جموں میل میں ملے تھے.....''

''اور ہاں وہ تمہاری ساتھی لڑکی.....''

وہ لڑکی تو یہیں پر تھی..... ابھی ابھی اس کو ایک گاہک ملا ہے..... جس کو نپٹانے

کے لئے وہ اوپر کوٹھے پر گئی ہے.....''

''اور وہ لڑکا؟......''

''اس نے بھڑوے کا پیشہ اپنا رکھا ہے۔ پھر جیب کترنے کا کام بھی کبھی کبھی کر لیتا ہے..... دہلی میٹروپولیٹن شہر ہے۔ یہاں کثیر تعداد میں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں..... وہ کسی کے پیچھے بھاگ دوڑ رہا ہوگا..... میری اس سے کچھ دنوں سے بات چیت بند ہے.....''

''کیوں!؟..... کیا ہوا؟.....''

''ایک رات آندھی کے ساتھ تیز بارش ہو رہی تھی..... میں کوٹھے پر اپنے دربے نما کمرے میں سونے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہ اچانک کہیں سے پی پلا کر میرے پاس آ گیا اس کے منہ سے شراب کی سخت بو آ رہی تھی۔ کہنے لگا مجھے یہیں پر سونے دو۔ پہلے میں نے مزاحمت کی، پھر نہیں ٹلا تو میں نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہاں پر سو جاؤ۔ کچھ ہی دیر میں وہ میرے ساتھ زبردستی کرنے لگا۔ میرے مزاحمت کرنے پر اس نے میری قمیص پھاڑ دی، میری شلوار کی ڈور توڑ دی، میں نے جم کر اس کی لاتوں وگھونسوں سے خبر لی۔ اس نے نہ جانے کہاں سے بلیڈ نکال لیا۔ قریب تھا کہ وہ چلا دیتا اور میں لہولہان ہو جاتی۔ وہ تو کہئے کہ بھگوان نے مجھے بچا لیا ورنہ وہ تو میری جان ہی لے لیتا۔ میری سائڈ والی لڑکی نے شور سن کر آنٹی (کوٹھے کی مالکن) کو خبر کر دی۔ بڑی مشکل سے آنٹی نے معاملے کو رفع دفع کیا۔''

''مگر تم نے تو بتایا تھا کہ تم سرائے خلیل میں رہتی ہو.....'' میں نے بات کو آگے بڑھایا۔

''ہاں بات تو صحیح ہے..... اور آپ جو یہ سب کچھ اپنے سامنے دیکھ رہے ہیں..... یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے.....''

میرے باپ نے شروع ہی سے چپل کی فیکٹریوں میں کام کیا۔ کبھی یہاں چھوڑا تو وہاں پکڑا اور کبھی وہاں پکڑا تو یہاں چھوڑا، فیکٹری کی آلودہ آب و ہوا کی وجہ سے ان کا پھیپھڑا خراب ہو گیا۔ اب مرنے کے قریب ہیں، بس ان کو اپنی موت کا انتظار ہے۔ ماں کوٹھیوں میں جھاڑو پونچھے لگاتی ہے۔ مگر اس سے کیا بنتا ہے اب ان کی بھی صحت خراب رہنے لگی ہے۔ گڑیا (میری چھوٹی بہن) سرکاری سکول میں پڑھتی ہے۔ مانا اُس کی فیس گھر سے نہیں دینی پڑتی ہے مگر پیٹ کی آگ تو بجھانی ہی ہے۔

میں شروع ہی سے ماتا ویشنو دیوی کی بھگت رہی ہوں۔ یہ یاترا کافی مشکل و دشوار گزار ہوتی ہے۔ دوسری طرف میرے پاس ذرائع وسائل کی بھی کمی ہے۔ مگر ماتا پر اٹوٹ آستھا اور وشواس سے سب کچھ آسان ہو جاتا ہے۔ میں وقفہ وقفہ سے وہاں جاتی رہتی ہوں اور وہاں سے زندگی میں پیش آنے والی مشکلوں و کٹھنائیوں کا سامنا کرنے کے لئے پریرنا و شکتی لے کر لوٹتی ہوں اور پھر ماتا کے آشیرواد سے اپنے دھندے میں لگ جاتی ہوں۔ اس دن جموں میل سے میں وہیں سے لوٹ رہی تھی کہ آپ سے ملاقات ہو گئی۔

میں نے سوچا کہ کام خراب ہے گھر پر لفڑا کون پالے۔ ہر روز شام ڈھلے یہاں آ جاتی ہوں اور جو بھی ایک دو گاہک ملے ان کو نپٹاتی ہوں۔ کوٹھے کی مالکن جن کو ہم سب لوگ آنٹی کہتے ہیں فیصد کے لحاظ سے ادائیگی کرتی ہوں۔ بقیہ اپنے پاس رکھتی ہوں اور پھر میں آخری بس سے سرائے خلیل روانہ ہو جاتی ہوں کیونکہ گھر تو اپنا وہاں پر ہی ہے۔ ماں باپ بھی وہیں پر ہیں اور سب سے بڑھ کر گڑیا ہے اور جس سے میں بہت زیادہ محبت کرتی ہوں اور جو میری مستقبل کی اُمید بھی ہے۔

☆☆

# بلاؤز

شروع سے ہی میرا دل پڑھائی لکھائی کی طرف کم اور شور وشر کی طرف کچھ زیادہ ہی مائل تھا۔ بڑی کھینچ تان کے بعد جب میں کالج میں پہنچا تو یہاں پر میرا زیادہ تر وقت لڑکیوں کی ناز برداریوں مثلاً ان کی فیس جمع کروانا، ان کے لئے لائبریری سے کتابیں ایشو کروانا یا ان کو ان جگہوں پر لے جانا جہاں پر ان کا بحیثیت جنس لطیف پہنچنا ذرا مشکل ہوتا یا پھر پروفیسروں اور کلرکوں سے لڑنے جھگڑنے میں گزرتا تھا۔

اسی بیچ میں امتحان آ گیا، میں نے بڑی ہی محنت و مشقت اور سورس و پیروی کے بعد تھرڈ ڈویژن سے بی۔اے پاس کیا۔ میرے ماتا پتا کی خواہش تھی کہ میرے پڑوسی لالہ بالمکند جن کو کبرسنی کی وجہ سے اپنی دکان کا حساب و کتاب رکھنے میں دقت ہو رہی ہے۔ ان کے پاس اپنا کچھ وقت گزاروں۔ مگر اس کام سے مجھے قطعی کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ یوں کہہ لیجئے کہ ایک چڑ سی تھی اس کی ایک اہم وجہ تو یہی تھی کہ میں ہمیشہ ہی اس سبجیکٹ میں زیرو رہا۔ دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ قدرت کو میرے لئے کچھ اور ہی منظور تھا۔

ہوا یوں کہ میرے محلے میں ایک جرنلسٹ صاحب رہتے تھے۔ جن کے ساتھ میرا شروع سے ہی اٹھنا بیٹھنا رہتا تھا اور میں ان کے کاموں میں کسی حد تک دلچسپی بھی لینے لگا تھا اور اب میں ان کی مدد سے تھوڑا بہت لکھ پڑھ بھی لیتا تھا جو ان کی اصلاح کے بعد اخبارات و رسائل میں شائع بھی ہو جاتا تھا۔ اسی بیچ میں ایک مقامی ہندی روزنامے میں جز

وقتی نامہ نگار کا اشتہار نکلا۔

کچھ ان جرنلسٹ صاحب کی مہربانی اور کچھ اپنے تجربے کی بنا پر اس کام کے لئے میرا سلیکشن ہو گیا۔ یہاں پر ہر شعبہ زندگی سے متعلق الگ الگ نامہ نگار تھے۔ مجھے جو شعبہ ملا وہ انسانی صحت کا تھا۔ میں دن بھر ہسپتالوں اور کلینکوں کے چکر لگاتا اور اپنے اخبار کو خبریں بھیجتا۔

سرکاری ہسپتالوں کا حال بڑا ہی ناگفتہ بہ تھا۔ ان کا زیادہ تر وقت آنکھوں، ناکوں کے کیمپوں یا پھر پنیر پکوڑوں کی دکانوں پر چھاپے ماری کے منصوبوں پر گزرتا تھا۔ ڈاکٹر رجسٹر پر اپنی ڈیوٹی پر ہونے کے باوجود ڈیوٹی پر کم ہی ہوتے۔ مریض بے چارے کراہتے پریشان رہتے۔

پرائیویٹ ہسپتالوں اور کلینکوں کا اس سے بھی زیادہ برا حال تھا جب بھی وہاں کوئی مریض پہنچتا تو ڈاکٹر سمیت ہسپتال کا عملہ ان پر لٹیروں کی طرح ٹوٹتا اور پھر یہ تیر کا تار اور سوئی کو تلوار بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے۔

یہاں پر اور بھی کئی طرح کے ڈرامے ہوتے، کبھی ڈاکٹر مریض سے وہ دوا منگوا لیتا جو اس مریض کے کام کی نہیں ہوتی اور چپکے سے دوسرے مریض کو دے دی جاتی اور بدلے میں اس سے خطیر رقم وصولی جاتی۔ کبھی یہ بھی ہوتا کہ مریض سے کوئی خاص دوا کسی خاص کیمسٹ کی دکان سے منگوالی جاتی اور پھر مریض کو استعمال کرائے بغیر پھر اسی کیمسٹ کو ہی لوٹا دی جاتی۔

ہسپتال کے عملے کا مریض اور ان کے رشتے داروں پر اتنی زیادہ دھاک ہوتی کہ وہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی ''ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم'' کی مثال بنے رہتے۔ ایسے میں مریض کی حالت کیا اچھی ہونی تھی اس کے رشتے دار اس کی لاش ہی لے کر باہر نکلتے تھے۔

یہاں میری حالت بھی کچھ خاص بہتر نہیں تھی۔ایک تو پہلے سے ہی میرے گھر کی معاشی حالت خراب تھی۔دوسری طرف نامہ نگاری کے نام پر مجھے جو پیسے ملتے تھے وہ آٹے میں نمک کے برابر تھے۔یہاں پر اگر چہ سوسائٹی کے ہر زمرہ کے لوگوں سے میرا سابقہ پیش آتا تھا مگر ہر کوئی ستا ستایا اور پریشان، میں کسی کے آگے ہاتھ بھی نہیں پھیلا سکتا تھا۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ اخبار کے ہر شعبہء زندگی سے متعلق نامہ نگاروں کی حالت ہی بدتر تھی بلکہ جو لوگ لیڈروں وافسروں کی خبریں چھاپتے تھے ان کے بڑے ہی وارے نیارے تھے بس خبریں چھپنے کی دیر ہوتی جو یہ لوگ اخبار کے مالکان کی چاپلوسی کر کے بخوبی کرلیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ میرا ایک سرکاری ہسپتال میں ایک ایسے انسان نما بھیڑیئے سے سابقہ پیش آیا جو ایک پانچ چھ سالہ لڑکی کے ساتھ جنسی استحصال کے الزام میں جیل سے سپرم ٹیسٹ(Sperm Test) کے لئے ہسپتال لایا گیا واقعہ یوں ہوا کہ لڑکی کے ماں باپ اپنے گھر کے پاس ہی ایک چپل کی فیکٹری میں یومیہ اجرت پر کام کاتے تھے۔لڑکی دن بھر وہیں آس پاس میں دوڑتی بھاگتی رہتی تھی۔یہ بھیڑیا فیکٹری کے قریب ہی ایک فلیٹ کرائے پر لے کر رہ رہا تھا ایک روز اس نے کسی طرح سے بہلا پھسلا کر لڑکی کو اپنے فلیٹ میں لے آیا۔ مگر لڑکی نے فوراً ہی خود کو تنہا اور کچھ اس کی کریہہ حرکتوں کو دیکھ کر رونا دھونا شروع کر دیا۔اس نے گھبراہٹ میں جلدی جلدی اپنے کمرے کے باہر ہی لڑکی کو روتا بلکتا چھوڑ کر اپنا گیٹ اندر سے بند کرلیا۔

ادھر شام ہو چکی تھی،اس کے ماں باپ بھی اب کام سے واپس آچکے تھے۔لڑکی کی تلاش شروع ہوئی۔کوئی کہتا ابھی میں نے یہیں پر دیکھا ہے،کوئی کچھ اور لڑکی کے ماں باپ جواب اُس کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک چکے تھے۔اچانک اسے فلیٹ میں پا کر جہاں کچھ خوش تھے وہیں کچھ پریشان بھی۔کبھی وہ لڑکی کو پچکارتے،تو کبھی پاگلوں کی طرح اُس کے

جسم کوٹٹولتے اورلڑکی تھی کہ اپنے کپڑے پر لگے بدنما دھبے کو دیکھ دیکھ کر مسلسل روئے جارہی تھی۔اب وہ دھبے اس کے والدین کی نظروں سے بھی اوجھل نہیں رہ سکے۔قبل اس کے کہ وہ اس پر کچھ ردعمل ظاہر کرتے۔ اسی بیچ میں سارے معاملے کو بھانپ کر کسی نے پولیس کو فون کردیا۔آناً فاناً میں پولیس کی کئی گاڑیاں آگئیں۔لوگوں کی نگاہیں اسی بھیڑیئے کی طرف اٹھنے لگیں۔وہ انکار پر انکار کرتا رہا، مگر پولیس والے اُسے پکڑ کر لے گئے۔پہلے تو لڑکی کا طبی معائنہ ہوا، بلاتکار ثابت نہ ہوسکا جس پر لڑکی کے والدین نے راحت کی سانس لی، مگر یہ معاملہ یہیں پر نہیں ٹھہرا۔ مقامی محلہ سدھار کمیٹی کے ممبران کا کہنا تھا کہ ہم مانتے ہیں کہ طبی رپورٹ صحیح ہے بلاتکار نہیں ہوا۔ پھر یہ دھبے لڑکی کے کپڑے پر کہاں سے آئے۔اب اس کی جانچ ہو۔اس انسان نما بھیڑیئے کے بہی خواہوں کا کہنا تھا کہ اب پھر دوبارہ جانچ ہو اس سے بہتر یہی ہوگا کہ کچھ دے دلا کر معاملے کو عدالت سے باہر ہی نپٹا لیا جائے۔جس کے حق میں کسی حد تک لڑکی کے والدین بھی تھے۔مگر کمیٹی کے ممبران کے آگے یہ لوگ بے بس تھے۔ مگر یہ انسان نما بھیڑیا ان سے بھی بہت آگے نکلا۔اس نے لیبارٹری کے عملے کو کچھ پیسے دے کر جو یقیناً وہ لڑکی کے والدین کو دینا چاہتا تھا۔اس سے کہیں کم تھے جانچ رپورٹ ہی تبدیل کرادی۔ فائنلی جب رپورٹ آئی تو لوگ دیکھتے ہی رہ گئے، بھیڑیا آزاد ہوگیا۔

میں ایک صبح شہر کے ایک بڑے سرکاری ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ سے گزر رہا تھا۔میں نے برآمدے میں کچھ لوگوں کو سرگوشی کرتے ہوئے دیکھا۔جب میں تھوڑا ان کے اور قریب ہوا تو مجھے پتہ چلا کہ کوئی لڑکی نازک حالت میں ہسپتال میں لائی گئی ہے۔ معاملہ مشکوک ہے میں نے جب اندر جا کر دیکھا تو کوئی ۲۴/ ۲۵ سال کی لڑکی بیڈ پر بے ہوشی کی حالت میں پڑی تھی۔

گول مٹول چہرہ، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، کچھ کلوندھے ہونٹ، ستواں ناک، لمبے لمبے بال، سانس کے زیروبم سے جہاں اس کے سینے کا ابھار صاف ظاہر ہورہا تھا۔

وہیں شلوار کی تہ بہ تہ جمی کرچوں سے اس کے زانوں کی گولائی وموٹائی کا اندازہ لگانا مشکل تھا، مگر جب بھی میری نظریں اس کے شلوار کی کرچوں پر پڑتیں تو فضا میں آگ کی ایک لپٹ سی پیدا ہوتی مجھے اپنی نظروں کی ڈھٹائی سے ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے کہ راکھ کے ڈھیر میں اسے کسی چنگاری کی یا پھر کوئلے کی کان میں کسی ہیرے کی تلاش ہو۔

ہسپتال کا طبی عملہ اسے میڈیکل ایڈ پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا اس وقت دخل در معقولات بہتر نہیں تھا اور میں نے وہاں سے گزر جانا ہی بہتر سمجھا مگر اب میرا روز کا معمول ہو گیا کہ جب بھی میں ادھر سے گزرتا تو اس لڑکی پر ایک اچٹتی نظر ضرور ڈال لیتا۔ مجھے کبھی بھی وہاں پر اس لڑکی کا کوئی شناسا نظر نہیں آیا۔ میں نے کئی مرتبہ اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی مگر نرسوں نے مجھے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ ابھی تو اس سے پولیس نے بھی کوئی بیان نہیں لیا ہے۔

ایک دوپہر کی بات ہے میں حسب معمول ہسپتال پہنچا اتفاق سے اس وقت اس کے پاس کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ میں اس کی طرف بڑھا قبل اس کے کہ میں کچھ پوچھتا وہ مجھ سے ہی پوچھ بیٹھی۔

''تم کون ہو؟.....''

''پترکار ہوں..... آپ کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہوں.....''میں نے جواب دیا۔

''مرد اور پترکار..... کریلا اور نیم چڑھا..... تم بہت ہی زیادہ..... تم بہت ہی زیادہ خطرناک ہو گے.....''وہ زیر لب بڑبڑائی۔

وہ آگے کچھ بتانے پر آمادہ نہیں ہوئی۔ پھر نرسیں بھی آگئیں۔ میں نے مزید وہاں پر ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا اور پھر فوراً ہی وہاں سے گزر گیا۔ مگر میں نے اس سے ملنا ابھی بھی ترک نہیں کیا تھا۔ میں بس ایک موقع کی تلاش میں تھا۔ میرے روز آنے جانے سے اب وہ

کسی حد تک مجھ سے مانوس ہو چکی تھی ایک روز وہ کسی حد تک ہوش میں تھی اور اتفاق سے اس کے آس پاس بھی کوئی نہیں تھا۔ میرے پوچھنے پر وہ شروع سے اپنے بارے میں بتانے لگی۔ پاپا کے ساتھ ساتھ میری ممی بھی جاب کرتی ہیں۔ میرے گھر میں روپے پیسے کی فراوانی ہے۔ میرا چھوٹا بھائی بنگلور سے انجینئرنگ کر رہا ہے۔ میرے یہاں آنے والے معمولی سے معمولی مہمان کا بھی استقبال بوتل کی کاک توڑ کر کیا جاتا ہے۔ ہمارے گھر میں سیکس سے لے کر پالیٹکس تک ہر موضوع پر بے تکلفانہ گفتگو ہوتی ہے۔

ایسے ماحول میں پل بڑھ کر جب میں کالج سے یونیورسٹی میں پہنچی تو مجھے یہاں پر جو ماحول ملا وہ بہت ہی کھلا ہوا تھا۔ یہاں لڑکے تو لڑکے، لڑکیاں بھی اس طرح لڑکے تبدیل کر لیا کرتی تھیں جیسے کہ کوئی کپڑا تبدیل کرتا ہے۔ پھر کسی کو کسی سے نہ کوئی شکوہ نہ گلہ ہر کوئی اپنے میں مگن و خوش ایسے رومان پرور ماحول میں قریب ۵ سال تک رہی۔ اس مدت میں، میں نے درجنوں لڑکوں سے تعلقات بنائے، میں کب کس سے جڑی اور کب کس سے الگ ہوئی مجھے کبھی اس کا احساس بھی نہیں ہوا۔ میں جب کبھی اخبار میں پڑھتی کہ فلاں پریمی جوڑے نے عشق میں ناکام رہنے کے بعد خودکشی کر لی ہے۔ تو میں ان کی بے وقوفی پر سر پیٹ لیا کرتی تھی۔

یونیورسٹی کے یہ ۵ سال تعلیم اور تعلقات کے بیچ کچھ اس طرح سے دبے پاؤں گزر گئے کہ مجھے اس کا احساس تک نہیں ہوا۔ گھر لوٹنے کے تصور سے ہی میرے دل و دماغ میں ایک ہول کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ممی پاپا جہاں اپنی جاب کی وجہ سے خود انحصار تھے وہیں انہیں اس جاب نے ایک دوسرے کے تئیں لاپروا بھی بنا دیا تھا جس کی وجہ سے گھر کا ماحول قدرے پراگندہ رہتا۔

میں نے اپنی تعلیم کی تکمیل کے باوجود اپنے گھر کا رخ نہیں کیا بلکہ اس کا حل یہ نکالا کہ میں نے ایک معمولی سی جاب پکڑ لی جبکہ اس کی مجھے قطعی ضرورت نہیں تھی بس یہ باہر

نکلنے اور خود کو مشغول رکھنے کا ایک بہانہ تھا۔ اس دوران میں اپنے آفس کے ہی ایک لڑکے کے رابطے میں آگئی اور کچھ ہی دنوں میں ہم دونوں اتنے قریب آگئے کہ فلیٹ کرائے پر لے کر ساتھ ساتھ رہنے لگے۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کی خواہشات کا بڑا احترام کرتے۔ اسی بیچ میں، میں حاملہ ہوگئی۔ میں چاہتی تھی کہ یہ رشتہ شادی کے بندھن میں بندھ جائے، میں نے اس لڑکے کے اوپر دباؤ بھی بنایا مگر وہ بڑا ہی گھاگ نکلا۔ وہ اس کے لئے آمادہ نہیں ہوا اور ہمارا رشتہ منقطع ہوگیا۔

اب تک میری زندگی بڑی ہی ہما ہمی میں گزری تھی، مگر اب میں نے تھک ہار کر اپنے گھر کی راہ لی اور بہت ہی زیادہ ڈپریشن میں رہنے لگی۔ میرے والدین بھی اب میرے معاملے سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے اور وہ میرے لئے جی جان سے مناسب رشتے کی تلاش میں لگ گئے۔ اسی بیچ میں انہوں نے میرے لئے ایک رشتہ بھی کھوج نکالا اور بلا تاخیر مجھے رشتہ ازدواج میں منسلک کردیا۔ میرا شوہر دلجیت پیشے سے سافٹ ویئر انجینئر تھا۔ بڑا ہی شریف ظاہر و باطن بالکل ایک جیسا میں نے اپنے ماضی کو دفن کر کے بڑے ہی پیار و محبت وعزم وحوصلے کے ساتھ ایک نئے رشتے کی شروعات کی میں نے جلد ہی اندازہ لگا لیا کہ دنیاوی معاملے میں دلجیت بہت ہی زیادہ بودا اور نرا اناڑی ہے، ماں کی نصیحت کے پیشِ نظر میں نے کسی بھی معاملے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی بجائے ایک تجاہل عارفانہ سے ہی کام لینے کی کوشش کرتی رہی مگر ان سب کے باوجود جب کبھی اس کی حماقتیں حد سے زیادہ بڑھ جاتیں تو میرے لئے خود پر کنٹرول رکھ پانا ممکن نہیں ہوتا اور نہ چاہتے ہوئے بھی میں کسی نہ کسی بہانے سے معاملے میں مداخلت کئے بغیر نہیں رہ پاتی، وہ مجھے بڑی ہی تجسسانہ نظروں سے دیکھا کرتا۔

اسی بیچ میں شادی کے بعد پہلی مرتبہ ہم دونوں گوا سیر سپاٹے کے لئے نکلے اور ابھی ابھی واپس لوٹے تھے۔ میری فرینڈ اور پڑوسن سمن جس نے یونیورسٹی میں کئی سال

میرے ساتھ گزارے تھے اور اب جو شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ بنگلور میں رہ رہی تھی۔ اپنے چھوٹے بھائی کی شادی میں آئی ہوئی تھی۔ میرے یہاں آ گئی۔ ہم دونوں بچھڑے دوست بڑے ہی والہانہ انداز میں ایک دوسرے سے چپھی مار کر ملے۔ سمن کی آمد سے ماحول زعفران زار بن گیا۔ وہ بات بات پر شگوفے چھوڑتی لطیفے سناتی جس پر ہم لوگ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔

دلجیت کے سفر کی تھکاوٹ یا پھر کسی اور وجہ سے ہم لوگوں کا ساتھ نہ دینے کا سمن نے کچھ اور ہی مطلب نکال لیا۔ جب ہنسی مذاق کا ماحول تھوڑا ٹھنڈا ہوا تو سمن بڑے ہی معنی خیز انداز میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''اور جیجا جی تمہارا خیال بھی رکھتے ہیں یا نہیں؟......''

''پرلے درجے کے بدھو ہیں......'' میں نے جواب دیا۔

''وہ کیسے؟......'' سمن جھٹ سے بولی۔

''ان سے تو سہاگ رات میں میرے بلاؤز کا بٹن بھی نہیں کھل رہا تھا......'' اچانک میرے منہ سے نکل گیا۔

''پھر تم نے کیا کیا؟......'' سمن نے فوراً دوسرا سوال جڑ دیا۔

''وہ بہت ہی پریشان تھے...... میں نے خود ہی کھول دیا......''

سمن کے قہقہوں سے کچھ دیر ہمارے گھر کا پورا ماحول ہی گونج اٹھا جس میں، میں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

دلجیت جو اب تک ہم لوگوں کی باتوں کو بغور سن رہا تھا، چونک پڑا۔ اس کا چہرہ اتر گیا۔

سمن اپنے گھر جا چکی تھی، دلجیت کے چہرے کی کیفیت ہر لمحے تبدیل ہو رہی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے کہ دلجیت سچ مچ کہیں سہاگ رات کی آڑی ترچھی پگڈنڈیوں

کے تصور میں کھو گیا ہو۔ مگر وہ اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکا۔ ہاں ممکن ہے کہ یہ تمہارے لئے رٹا رٹایا سبق رہا ہو مگر میرے لئے ایسا بالکل نہیں تھا۔ پھر میرے دماغ میں ماں کی وہ بات گردش کرنے لگی جو اس نے شادی کے وقت مجھ سے کہی تھی۔ ''مرد بہت ہی زیادہ وہمی وشکی مزاج ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے کوئی بھی ایسی ویسی بات نہیں کرنا۔ میرے اور تمہارے پاپا کے رشتے میں تلخی کی اہم وجہ میری بے تکلفانہ گفتگو اور میرا ھنسوڑا پن ہی ہے۔'' پھر میں یہ بھی سوچتی کہ آخر میں نے ایسی کون سی بات کہہ دی کہ دلجیت آپے سے باہر ہو گیا۔

بہر حال یہ واقعہ ہماری زندگی میں کسی حد تک دراڑ کی وجہ بن گیا۔ میں چاہتی تھی کہ میں فوراً حاملہ ہو جاؤں اور کوئی بچہ پیدا ہو جو کہ ہم دونوں کے بیچ موانست کا ذریعہ بنے، مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے کہ کالج، یونیورسٹی اور پھر نوکری کے درمیان مسلسل اسقاط حمل نے میری زرخیزی کو بانجھ پن میں تبدیل کر دیا ہو۔ میں نے اس سلسلے میں کئی لیڈی اسپیشلسٹ سے بھی رابطہ قائم کیا۔ مگر ناکام رہی۔

دلجیت کی دلچسپی دھیرے دھیرے مجھ میں کم ہوتی جا رہی تھی۔ اکثر جہاں وہ مجھے طنز وتعریض کا نشانہ بناتا وہیں اب اس نے میرے اوپر ظلم وستم بھی ڈھانا شروع کر دیا۔ کئی مرتبہ یہ اتنا زیادہ بڑھ جاتا کہ مجھے اس کے پاس سے بھاگ کر ممی کے یہاں پناہ لینی پڑتی۔ مگر کچھ ہی دنوں بعد پھر ممی مجھے سمجھا بجھا کر اس کے پاس بھیج دیا کرتیں۔

دلجیت کے ظلم وستم کی ممی یہ توضیح کرتیں کہ سانڈ کا گائے کو سینگیں مارنا، کتے کا کتیئے کو کاٹنا، کاٹنا نہیں سمجھا جاتا ہے بلکہ یہ پیار ومحبت کا ایک طریقہ ہے۔

میں انہیں اپنے اور دلجیت کے درمیان پک رہے لاوے کے بارے میں سمجھانے سے قاصر تھی۔ اکثر جب میں دلجیت کے ساتھ کسی پارٹی میں نہ چاہتے ہوئے بھی شریک ہوتی تو دلجیت جسے میں اب تک بڑا ہی شریف اور معصوم سمجھا کرتی تھی۔ وہ اب میرے سامنے ہی شراب پی کر کسی اور عورت کی بانہوں میں جھولنے لگتا بلکہ بات کبھی کبھی تو

یہاں تک پہنچ جاتی کہ وہ میرے سامنے ہی اس کو چومنے بھی لگتا جو میرے لئے اکثر و بیشتر سوہان روح ثابت ہوتا۔

اسی بیچ میں مجھے اڑتے اڑتے یہ خبر بھی ملی کہ وہ اپنی آفس کی ہی کسی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہوگیا ہے۔ بلکہ بتانے والوں نے تو یہاں تک بتایا کہ اس لڑکی سے اس کو ایک بچہ بھی ہے۔

دلجیت کی حرکت سے میں کبیدہ خاطر تھی کہ ایک روز جب گھر پر کوئی نہیں تھا اور میں مایوسی وڈپریشن کے اتھاہ سمندر میں ڈوبی ہوئی تھی کہ اچانک مجھے گھر کے ایک کونے میں کاکروچ مارنے کی دوا نظر آئی۔ میں نے بدحواسی میں وہ دوا کھالی۔ دوا کھانے سے دھیرے دھیرے میری طبیعت خراب ہونے لگی چونکہ یہ شام کا وقت تھا گھر کی نوکرانی کو صفائی کے لئے آنا تھا۔ جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوئی۔ وہ مجھے کسمپرسی کی حالت میں دیکھ کر تھرا گئی پہلے تو اس نے چیخ چیخ کر پڑوسیوں کو اکٹھا کیا۔ پڑوسیوں نے یہ چالاکی کی کہ خود کو کسی بھی طرح کے الزام سے بچائے رکھنے کے لئے ایک ساتھ ہی پولیس وایمبولینس کو بلالیا۔ ایمبولینس والے فوراً مجھے یہاں لے کر آگئے۔

یہ کہتے کہتے وہ لڑکی نہ جانے اچانک کہاں کھوگئی۔ اس کے اوپر ایک لرزہ کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ پھر وہ بے ہوش ہوگئی۔ جب وہ ہوش میں آئی تو اس نے پاس ہی پڑی پلاسٹک کی نلیوں سرنجوں و دیگر سامان کو ایک ایک کر کے پھینکنا شروع کردیا۔ میں ڈیوٹی روم کی طرف بھاگا۔ نرسوں کو بتایا۔ جب میں واپس آیا تب تک لوگوں کی بھیڑ اکٹھا ہوچکی تھی ۔ میں نے وہاں سے کھسک جانا ہی مناسب سمجھا۔ اس کے بعد دو چار دنوں تک جب کبھی بھی میں اس کے پاس سے گزرتا اس کے اردگرد مجھے نرسوں وڈاکٹروں کا سخت پہرہ نظر آتا۔

ایک روز پھر جب اس کے آس پاس کوئی نہیں تھا، میں بڑے احتیاط سے اس کے پاس پہنچا، میں نے بلاتمہید وہیں سے گفتگو شروع کی۔

میں نے کہا۔

"مگر تمہارے جیسی پڑھی لکھی اور کھلے مزاج کی لڑکی سے کاکروچ کی دوا کھا لینے کی بات میرے گلے نہیں اُترتی ہے....."

اس پر گورپریت نے کہا۔

"دلجیت نے بلاؤز والی بات کو مدعا بنا کر عدالت میں طلاق کی عرضی داخل کر دی اور دعویٰ کیا کہ جو لڑکی سہاگ رات میں خود ہی اپنے بلاؤز کے بٹن کھول سکتی ہے اس کے کریکٹر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے؟....."

میں نہیں چاہتی تھی کہ معاملہ عدالت میں لمبا کھینچے اور میں اپنے والدین اور رشتے داروں کی نظروں سے گروں میں نے چند ایک پیشی ہی میں دلجیت کو طلاق دے دی۔

# کانوینٹی لڑکی

منوہر نے اپنی اب تک کی زندگی میں شاید کبھی کوئی ایسا کارِ خیر ہی کیا ہوگا یا پھر اس کی قسمت کچھ اچھی رہی ہوگی کہ اس روز چلتی بس سے کودنے کے باوجود وہ محفوظ رہا۔ ورنہ یقیناً اس روز اس کی جگہ کسی ہسپتال میں ہوتی یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی روح ہی اس کے جسمِ خاکی کو الوداع کہہ گئی ہوتی اور وہ کسی شمشان گھاٹ کی راکھ میں تبدیل ہو گیا ہوتا۔

اسے کوئی اعجوبہ یا پھر اتفاق ہی کہئے کہ منوہر کے دل و دماغ پر الف ننگی لڑکیاں جنسی لحاظ سے وہ اثر نہیں چھوڑتی تھیں، جو نیم برہنہ یا پھر زیرِ جامہ میں ملبوس لڑکیاں چھوڑتی تھیں۔

منوہر کا بچپن شروع ہی سے دائی، ماماؤں کے بیچ میں گزرا اور کئی بار اس کا ان کے الف ننگے جسموں سے سابقہ بھی پیش آیا۔ مگر ان جسموں کا اس کے اندر حرارت پیدا کرنا تو دور اس نے ان کی طرف نظر اٹھا کے بھی دیکھنا گوارا نہیں کیا۔

اس کے پتا کی گاؤں سے باہر کپڑے کی ایک معمولی سی دکان تھی۔ چونکہ فیملی بڑی تھی اس لئے ناشتہ کا انتظار کئے بغیر وہ علی الصبح ہی دکان پر پہنچ جایا کرتے تھے۔ بعد میں منوہر ان کا ناشتہ لے کر جایا کرتا تھا۔ وہاں پہنچنے کے لئے منوہر کو جن خاص راستوں سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا ان میں بالعموم فورتھ کلاس کے لوگ آباد تھے جو معمولی کاروبار و پیشے سے جڑے ہوئے تھے۔

ان کی عورتیں شوہروں کے اپنے کام اور بچوں کے سکول جانے کے بعد جھاڑو پونچھے میں لگ جاتیں۔ اس عمل کو انجام دیتے وقت ان کی عموماً آدھی چھاتیاں ان کے کپڑوں سے باہر آجاتیں۔ منوہر جب وہاں سے گزرتا تو ان کو بڑے ہی غور سے دیکھتا۔ یہ منظر اُس کو بڑا ہی بھلا لگتا اور اکثر وہ ان کو دیکھنے کے لئے اپنے پاپا کی کھٹارا سائیکل جو اکثر و بیشتر اس کے چلنے ہی گھر میں پڑی رہتی سے اتر جایا کرتا اور بڑی ہی توجہ سے ان کا مشاہدہ کیا کرتا۔ اگر کبھی کوئی منظر اس کی نظروں کو کچھ زیادہ ہی بھلا لگتا تو وہ آگے بڑھ جانے کے باوجود اس کو دوبارہ دیکھنے کے لئے پھر پیچھے مڑتا۔ ان مناظر کو دیکھنے میں اسے بڑا لطف آتا اور اس ۱۰ منٹ کے راستے میں کم از کم وہ اپنا آدھا گھنٹہ وقت صرف کرتا۔

تھوڑا بڑا ہونے کے بعد وہ اپنے گھر کے غسل خانے میں نہانے کی بجائے وہ ان ندی نالوں کا رخ کرتا جہاں پر نچلے طبقے کی لڑکیاں اپنے گھریلو کام کاج سے فارغ ہونے کے بعد بالٹی بھر کے اپنے گھر کے میلے کچیلے کپڑے لے کر پہنچتیں اور کپڑوں کی دھلائی کے بعد پھر وہ اپنا بدن بھی دھلتیں۔

منوہر ان لمحوں کا بڑی شدت کے ساتھ انتظار کرتا جب وہ اپنے بھیگے کپڑے تبدیل کرتی تھیں۔ کبھی قمیص تبدیل کرتے وقت اسے ان کی چھاتیوں کے کچھ حصے نظر آجاتے تھے۔ تو کبھی شلوار تبدیل کرتے وقت ان کی زانو کا کچھ حصہ.....

منوہر کو یہ منظر کچھ زیادہ ہی بھاتا اور اس کے اندر ایک طرح کا ارتعاش پیدا کر دیتا۔ یکلخت دیکھے جانے کے اس عمل میں کبھی کبھی اس کی آنکھوں سے آنسو بھی نکل آتے تھے۔

پھر اس کو اتفاق ہی کہئے کہ جب وہ پلس ٹو کے لئے اپنے گھر سے نکل کر شہر کے ڈگری کالج میں پہنچا تو وہاں پر بھی اُس کا ایسے ہی لا ابالی اور بے فکرے لڑکوں سے سابقہ پیش آیا جو ہفتہ کے دن ٹی۔ وی، سی۔ ڈی پلیئر منگوا کر اپنے روم پر ہی بدیشی فلم دیکھا کرتے تھے بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ان سب نے اس کے لئے باقاعدہ ایک کلب بنا رکھا

تھا۔ جس کا ایک باقاعدہ صدر اور سیکرٹری بھی تھا اور منوہر جیسے لوگ اس کے ممبر تھے۔ یہ پروگرام آپسی کنٹری بیوشن سے چلتا تھا۔

یہاں بھی منوہر کو وہ فلمیں زیادہ برانگیخت نہیں کر پاتی تھیں جو مادرزاد ننگی ہوتیں اور جس میں خالص جنسی عمل دکھایا جاتا تھا۔ اس کے برعکس وہ ان فلموں میں زیادہ دلچسپی لیتا تھا جن میں ڈائلاگ ہوتے، کچھ چھیڑ چھاڑ اور پھر کچھ دھڑ پکڑ اور پھر.....

آج منوہر کی طبیعت کچھ زیادہ ہی مضمحل و اداس تھی۔ بجھے دل سے اس نے برش کیا، غسل بھی نہیں کیا جو اس کا روز کا معمول تھا۔ ناشتہ بھی بہت تھوڑا کیا۔ کلاس جانے کے بارے میں سوچا تو اس پر ایک پژمردگی کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ کمرے میں بھی اس کو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے رشتے داروں سے ملاقات کا ارادہ کیا جو روزی روٹی کی غرض سے اسی شہر میں مختلف پیشوں سے جڑے ہوئے تھے۔

پھر فوراً ہی وہ کمرے سے نکل کر بس سٹاپ پر آ گیا اور بس پکڑ لی، مگر منزل مقصود پر پہنچنے کی بجائے کبھی وہ ایک بس کو چھوڑتا تو دوسری کو پکڑ لیتا اور دوسری کو چھوڑتا تو تیسری کو پکڑ لیتا۔

اسی پکڑ چھوڑ میں اب دو ڈھائی کا وقت ہو گیا تھا۔ اسی دوران اس کی بس ایک سٹاپ پر رکی۔ بس میں بہت ہی زیادہ بھیڑ تھی۔ منوہر نے بمشکل کھڑکی سے باہر جھانکا۔ پھر وہ دوسرے ہی لمحہ مسافروں کی صفوں کو چیرتا ہوا چلتی ہوئی بس سے کود پڑا۔ اس کو شدید چوٹیں آئیں اس کے باوجود بھی وہ فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

سکول کی چھٹی کے بعد ایک کانونٹی لڑکی بس سٹاپ پر بیٹھی ہوئی بس کا انتظار کر رہی تھی جس کی سکرٹ بڑے ہی بے ہنگم انداز میں اس کے زانو پر بکھری ہوئی تھی۔

☆☆

# لیگی

میرے آفس کے راستے میں ادریس قصائی کی دکان ہے۔ میرے آفس کے جانے کا وقت ہی کچھ ایسا ہے یا پھر اسے ایک اتفاق کہہ لیجئے جب بھی میں اس کی دکان کے پاس سے گزرتا ہوں۔ تو وہ مجھے اپنے ذبح کئے ہوئے بکرے کو رسّی کے سہارے دکان کی چھت سے لٹکائے اپنے ہاتھوں و گھونسوں کی مدد سے اس کی کھال کو ادھیڑتے ہوئے نظر آجاتا ہے۔ میں یہاں پر عام طور سے دور ہی سے اپنی رفتار کو دھیمی کر دیتا ہوں۔ ایسے میں جہاں ادریس کی آنکھیں لال اور اس کے چہرے کا حال بے حال ہوتا ہے، وہیں میں بھی اس کی اس حالت سے تھوڑا ٹینشن میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کوئی چیز ہے جو میرے اندر اٹک گئی ہے اور پھر جہاں بکرے کی کھال کے اتر جانے کے بعد ادریس قصائی راحت کی سانس لیتا ہے، وہیں مجھے بھی ایک طرح کا ذہنی سکون و خوشی کا احساس ہوتا ہے اور پھر میں آگے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو جاتا ہوں۔

آج جب میں آفس پہنچا تو سب سے پہلے میری نظر اپنی پرائیویٹ اسسٹنٹ دیپا پر پڑی۔ دیپا نے کچھ دنوں قبل ہی آفس کے ہی ایک کلرک سے لو میرج کی ہے۔ دیپا شادی سے قبل بالعموم شلوار پہنا کرتی تھی مگر ادھر کچھ دنوں سے میں اسے لیگی سوٹ میں دیکھتا ہوں۔ آج اس نے جو لیگی سوٹ پہن رکھا تھا اس کے اوپری حصے کا چاک کچھ زیادہ ہی پھیلا ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کی کمر کے ارد گرد پھیلے گوشت صاف نظر آرہے تھے۔ وہیں دوسری

طرف عام لیگیوں کے مقابلے میں اس کی لیگی بھی بہت ہی زیادہ ٹائٹ تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ادریس قصائی، بکرا اور بکرے کی کھال گردش کرنے لگی، میں سوچنے لگا کہ کیا دیپا کے شوہر کو بھی ادریس قصائی کی طرح ہی..... محنت و مشقت کرنی پڑتی ہوگی۔ جب تک میں آفس میں رہا اسی ادھیڑ بن میں مبتلا رہا۔

یہ نوکری جوائن کئے ہوئے مجھے ۵ سال ہو چکے ہیں۔ مگر میں اب تک کرائے کے مکان میں ہی رہتا تھا۔ بیوی کی روز روز کی چخ چخ کی آواز سن کر ادھر پہلی مرتبہ میں نے سوچا کہ اب مجھے اپنا مکان لے لینا چاہئے اور پھر میں نے فوراً ہی اپنی اس سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے دن دوگنی رات چوگنی کوششیں شروع کر دیں۔ کچھ تو پیسے خود میرے پاس تھے کچھ رشتے داروں سے لے کر میں نے اپنا مکان لے لیا۔ میرے مکان کے آس پاس جو لوگ رہتے ہیں ان سے مجھے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔

ایک تو میں خود فطرتاً خلوت پسند واقع ہوں۔ دوسری اہم وجہ میری تھکا دینے والی ڈیوٹی بھی ہے۔ ایک روز جب میں ڈیوٹی سے لوٹا تو میری بیوی مجھ سے کہنے لگی۔

"سامنے والے سردار جی کی بیوی..... اپنے یہاں آئی ہوئی تھی..... مٹھائی کا ڈبہ اور کارڈ دے کر گئی ہے..... ان کے بیٹے کی شادی ہے....."

مجھے شادی کا کارڈ پڑھ کر پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ سردار جی کا نام ترلوچن سنگھ ہے۔ بہر حال دن گزرتے دیر نہیں لگی۔ ان کے بیٹے کی شادی کا دن قریب آ گیا۔ مجھے پڑوسی ہونے کے ناطے ان کے گھر کی ظاہری سج دھج اور مہمانوں کی آمد سے لے کر ہر بات کا پتہ چل رہا تھا۔ مگر مجھے اپنی مصروفیات کی وجہ سے اتنا وقت نہیں مل پا رہا تھا کہ میں سردار جی کو مبارک باد ہی دے دوں اور بارات میں شریک نہ ہونے کے لئے معذرت کر لوں۔

اسی بیچ میں جب ایک شام ڈیوٹی سے لوٹا تو میری بیوی جس کا نام شیلا ہے کہنے لگی۔

''سردار جی!......آپ کو کھوج رہے تھے......میں نے ان کو بتایا کہ آپ ڈیوٹی سے ابھی نہیں آئے ہیں۔ جس پر انہوں نے کہا کہ جب بھی وہ آئیں تو کہہ دیجئے گا کہ مجھ سے مل لیں.....''

میں اپنی بیوی سے مخاطب ہوا۔

''ابھی ان باتوں کو چھوڑو.....میں کافی تھکا ہوا ہوں.....پہلے یہ بتاؤ کہ آج کیا کوئی خاص بات ہے جو تم اتنی بجی سنوری ہوئی ہو.....یہ لیگی سوٹ، یہ لپ سٹک.....یہ تمہارے کھلے کھلے بال میرے ذہن کے پردے پر پھر کہیں نہ کہیں ادریس قصائی بکرے کی کھال دیپا، دیپا کا شوہر اس کی لیگی گردش کرنے لگی۔ مجھے گم صُم دیکھ کر شیلا بگڑ گئی۔

''آپ کو پرائی عورتوں سے فرصت ملے تب نا.....''

بہر حال سردار جی کا سندیشہ پا کر میں فوراً ہی ان سے ملنے کی فکر میں لگ گیا۔ شادی کی وجہ سے ان کے گھر میں کافی چہل پہل تھی۔ میں نے سردار جی کو بہت تلاش کیا مگر وہ کہیں دور دور تک نظر نہیں آرہے تھے۔ میری ان کے گھر کے کسی دیگر فرد سے جان پہچان نہیں تھی کہ میں ان کے گھر میں جا بیٹھتا۔ اسی بیچ میں اچانک سردار جی مجھے نظر آئے۔ مجھے دیکھ کر وہ بہت زیادہ خوش ہوئے۔ میں نے بھی بظاہر خوشی ظاہر کی اور گلے مل کر ان کو مبارکباد دی وہ اپنے ساتھ مجھے گھر کی اوپری منزل پر لے گئے۔ جہاں پر ٹینٹ لگا ہوا تھا اور اس میں بڑے ہی سلیقے سے کرسیاں و میزیں لگی ہوئی تھیں۔ کچھ لوگ وہاں پہلے ہی سے موجود تھے جو مٹن، چکن و مچھلی فرائی کے ساتھ ساتھ پیگ پر پیگ اپنے حلق کے نیچے اتار رہے تھے۔

میں سردار جی کے ساتھ ایک خالی پڑی میز جس کے ارد گرد کئی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں ان پر بیٹھ گیا۔ بیرے نے میرے آگے بھی چکن، مٹن و مچھلی فرائی الگ الگ پلیٹوں میں سجا دیا۔

پھر سردار جی مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''بے تکلف!...... بولو...... وہسکی لو گے یارم؟......''

میرے یہ کہنے پر کہ میں یہ سب نہیں لیتا وہ ذرا ٹھٹھکے۔

پھر وہ بولے۔ ''چلو تھوڑی تھوڑی ہی لے لیتے ہیں.....''

میرے پھر انکار کرنے پر کہ۔ ''میں تھوڑی بھی نہیں لونگا.....''

وہ بولے۔ ''چلو چلو!!..... بیئر ہی لے لیتے ہیں.....''

میں نے کہا۔

''سردار جی!..... میں یہ بھی نہیں لوں گا..... بات یہ ہے کہ یہ چیزیں مجھے بالکل ہی سوٹ نہیں کرتی ہیں.....''

ابھی ان باتوں کا سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ سردار جی کو اچانک کوئی کام یاد آ گیا۔ وہ وہاں سے اٹھ کر یہ وعدہ کر کے چلے گئے کہ میں ابھی آتا ہوں۔

کچھ ہی دیر میں میرے پاس ہی میں جو ایک خالی میز پڑی ہوئی تھی اس پر ایک ادھیڑ عمر کا مرد اور اسی عمر کی ایک عورت اور ایک جوان سال صحت مند لڑکی آ کر بیٹھ گئی۔ لڑکی کے بال کھلے ہوئے تھے آنکھیں بڑی بڑی اور لیگی سوٹ زیب تن کئے ہوئے تھی۔ مرد کی نظر مچھلی میٹ سے کہیں زیادہ شراب پر تھی۔ عورت اور لڑکی کولڈ ڈرنک کے سہارے دھیرے دھیرے مٹن، چکن و مچھلی فرائی کے مزے لے رہی تھی۔ میری آوارہ نظر کا مرکز مرد اور عورت سے کہیں زیادہ لڑکی تھی۔ لڑکی کی نظر جب بھی میری نظر سے ٹکراتی وہ جھینپ جاتی۔ آنکھ مچولی کا سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ یہ لوگ بھی اٹھ کر چلے گئے۔

ان لوگوں کے جانے سے میری سوچ کا سلسلہ کسی حد تک منقطع ہو گیا۔ اب میں گوشت کے ان ٹکڑوں کو جو بیرا میرے پاس رکھ کر گیا تھا ساؤس (Sauce) کی مدد سے دھیرے دھیرے اپنے حلق سے نیچے اتارنے لگا۔

آج بھی جب میں آفس جاتے وقت ادریس قصائی کی دکان کے پاس سے گزر

رہا تھا۔ تو وہ حسب معمول اپنے ہاتھوں اور گھونسوں کی مدد سے بکرے کی کھال کو ادھیڑنے میں لگا ہوا تھا، مگر بکرا اتنا زیادہ صحت مند تھا کہ وہ اس کے قابو سے باہر ہو رہا تھا اور آج مجھے اس کا حال اور بھی زیادہ بے حال لگا مگر چونکہ آج میں خود گھر سے لیٹ آفس کے لئے نکلا تھا۔ اس لئے اس بات کی قطعی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ میں اس کے پاس کچھ دیر رکتا اور اس کا تماشہ دیکھتا۔

یہاں پر کچھ لوگ اور بھی موجود تھے جو مجھ سے کچھ دوری پر بیٹھے ہوئے تھے جن کی نقل وحرکت کسی حد تک مجھ سے اوجھل تھی۔ اب میں بھی وہاں پر سے اٹھنا چاہتا تھا۔ مگر میں یہ سوچ رہا تھا کہ سردار جی آجائیں تو میں ان سے اجازت لے کر جاؤں۔ سردار جی کافی دیر تک نہیں آئے۔ تو میں خود ہی وہاں سے اٹھ کر نیچے آگیا۔

نیچے لڑکے لڑکیاں پنجابی گانے کی دھنوں پر تھرک رہے تھے۔ مجھے وہیں پاس ہی میں سردار جی نظر آگئے۔ میں نے سردار جی کو ایک بار پھر مبارکباد دی اور اتنی اچھی دعوت کے لئے ان کا شکریہ ادا کیا۔

میں نے جیسے ہی اپنے گھر کا رخ کیا۔ میری نظر ایک بار پھر ناچنے والے لڑکے لڑکیوں پر پڑی۔ مجھے وہ بڑی بڑی آنکھوں والی لڑکی بھی وہاں پر نظر آئی۔ وہ بھی گانے کی دھنوں پر تھرک رہی تھی۔ پنڈال کے برعکس یہاں پر اس کا پورا ہی جسم میری نظروں کے سامنے تھا۔ اس کا قد متوسط جسم بھرا بھرا اور کھلے ہوئے بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے چوڑے گلے اور کالے رنگ کا فراک نما سوئٹر اور نیچے اسی رنگ کی نیلون کی لیگی پہن رکھی تھی۔ اس کی سوئٹر کی بناوٹ بہت ہی زیادہ گھٹی ہوئی نہیں تھی۔ بجلی کی تیز روشنی میں اس کے وہائٹ بریزیر کی سٹریپ وکٹوریاں صاف چھلک رہی تھیں۔

دوسری طرف اُس کی لیگی اتنی زیادہ باریک وتنگ تھی کہ جہاں اس کی جلد کی اندرونی رنگت صاف نظر آرہی تھی۔ وہیں اس کے جسمانی خطوط بھی نمایاں ہو رہے تھے، وہ

جب ڈانس کے دوران سٹیپ بدلتی تو مجھے زمین ہلتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

سردار جی سے جدا ہونے کے باوجود میں کافی دیر تک وہیں کھڑے کھڑے اس کے ڈانس سے لذت یاب ہوتا رہا۔ جب میں گھر پہنچا تو کافی رات ہو چکی تھی۔ میری بیوی میرا انتظار کر کے کب کی سو چکی تھی۔ میں اس کی بغل میں ہی لیٹ گیا۔

عام طور پر بستر پر جانے کے بعد مجھے فوراً نیند آجاتی ہے اور پھر خراٹے پہ خراٹے لینے لگتا ہوں جس پر اکثر میری بیوی کہا بھی کرتی ہے

''کہ تمہارے ساتھ سونے کا فائدہ بھی کیا..... تم کو بستر پر آنے کے بعد جیسے سانپ سونگھ جاتا ہے.....''

مگر آج نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ رہ رہ کر میرے ذہن کے پردے پر ڈانس پارٹی کے نقوش ابھر آتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی لمبے بالوں و باریک و تنگ لیگی والی لڑکی آجاتی۔ پھر اس کے ساتھ میری پرسنل اسسٹنٹ دیپا واس کا شوہر اور پھر فوراً ادریس قصائی اور پھر اس کا وہ موٹا بکرا.....

میں انہی سوچوں میں کچھ اس طرح الجھا کہ مجھے نیند آگئی اور نیند ہی میں نہ جانے کب میرا ایک ہاتھ میرے پاس سوئی اپنی بیوی کی لیگی کی لاسٹک پر اور دوسرا اس کے گلے پر پہنچ گیا۔ جب میری بیوی کو اپنی سانس گھٹتی ہوئی محسوس ہوئی تو اس نے ذبح ہو رہے بکرے کی طرح چیخیں نکالنی شروع کر دیں۔ اس نے مجھے اپنے ہاتھوں اور پیروں سے کچھ اس زور سے دھکا دیا کہ میں دھڑام سے بیڈ کے نیچے آگرا۔ اب میں چاروں شانوں چت فرش پر پڑا ہوا تھا۔ میرا جسم پسینے سے تر بتر تھا۔ میری زبان پر ادریس قصائی، بکرا و لیگی کا ورد جاری تھا۔ میری بیوی غصے سے لال بھبھوکا کسی بھری بندوق کی طرح میرے پاس ہی کھڑی ہوئی تھی۔ شور سن کر اب بچے بھی نیند سے بیدار ہو چکے تھے۔ میری بیوی نے مجھ سے صرف اتنا کہا کچھ اپنی عمر کا بھی خیال کر لیا کرو۔

☆☆

# پلیسہ

نیلو کا میڈیا میڈ ریکس میں یہ دوسرا اپائمنٹ تھا۔اس سے پہلے بھی اس نے اس آفس میں کچھ دنوں کام کیا تھا۔ پھر وہ کیوں چلی گئی اس کی خبر نہ تو رمیش کو اس وقت ہی ہوئی اور نہ اس نے تا ہنوز جاننے کی کوشش کی ۔ہاں اتنا ضرور تھا کہ دوسری مرتبہ جب وہ آئی تو اس کا آفس کے ایک ایسے شعبے میں اپائمنٹ ہوا جس میں اس کے علاوہ تمام ہی مرد تھے۔ یعنی اس شعبے میں وہ واحد لیڈی تھی۔

نیلو اگر چہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ساتھ ان تمام لوگوں سے ملنے کی خواہش مند رہتی جو ذرا بھی اس کی طرف جھکنے یا رغبت دکھانے کی کوشش کرتے۔مگر اس کے ساتھ جو لوگ کام کر رہے تھے۔وہ بڑے ہی دقیانوسی قسم کے تھے۔ان میں سے ہر کوئی اس سے بات کرنے کی خواہش بھی رکھتا اور ناک بھی سکوڑتا۔ ہر کوئی ایک دوسرے پر نظر ٹکائے رکھتا کہ کون آگے بڑھتا ہے۔

جب کسی دوسرے شعبے کا کوئی آدمی اُس سے وجہ یا بلا وجہ کے ہی باتیں کرنے کی کوشش کرتا تو نیلو اس سے لپک کر ملتی۔ ویسے ہی جیسے مقناطیس کا ٹکڑا لوہے کی طرف لپکتا ہے۔ایسے میں اس کا چہرہ ہی نہیں بلکہ انگ انگ کھل اٹھتا۔

نیلو تھی تو شادی شدہ یہی نہیں بلکہ ایک بچے کی ماں بھی تھی مگر جسمانی اعضاء کچھ اس قسم کی کساوٹ و تازگی لئے ہوئے تھے کہ ایسا لگتا تھا کہ ابھی تو ہوا بھی اس کے جسم سے

مس ہو کر نہیں گزری ہے۔

ایسے میں اُس کے ساتھی جو بظاہر اپنے کام کی طرف ملتفت ہوتے مگر بباطن ان کی نظریں اُس کے اوپر ہی گڑی ہوئی ہوتیں۔ وہ جل بھن کر کباب ہو جایا کرتے تھے۔

یہ قانونِ فطرت ہے۔ کیا آدمی اور کیا چرندو پرند ہر کوئی جہان پر اس کا آب و دانہ لکھا ہوا ہوتا ہے بلا کسی رکاوٹ کے پہنچ جاتا ہے۔ گدھوں کو مردار اور لومڑیوں کو شیر کا جھوٹا کھوجنے میں دیر نہیں لگتی ہے۔ ایسے میں دوسرے شعبے کے بھی اوباش قسم کے لوگ اپنی ہوس پرستی کی تسکین کے لئے کسی نہ کسی بہانے اس کے پاس پہنچ جاتے یا نہیں تو پھر اس کے اردگرد ہی منڈلایا کرتے۔ پھر بوڑھے بھی جو عام طور سے اپنے گھروں کے ٹھکرائے ہوتے کہاں پیچھے رہنے والے تھے۔ وہ بھی اکثر و بیشتر آشیرواد دینے کے بہانے اپنی کھردری ہتھیلیوں کو نیلو کے سر اور کندھوں پر رگڑنا نہ بھولتے تھے۔

نیلو کو جب یہ پوری طرح سے یقین ہو گیا کہ اس کے اپنے شعبے کے لوگوں کے مقابلے میں باہری لوگ کچھ زیادہ ہی اس کی قیمت لگا رہے ہیں تو وہ اب کل کانٹوں سے لیس ہو کر اپنی سیٹ پر بیٹھتی۔ دفتر آنے سے پہلے باقاعدگی سے بیوٹی پارلر جاتی، لمبے لمبے کھلے ہوئے بال جس رنگ کا سوٹ زیب تن کرتی اسی رنگ کے کانوں میں آویزے، پیشانی پر بندیاں اور ہونٹوں پر لپ سٹک لگاتی۔

دوسری طرف آفس میں اس کی سیٹ بھی ایسی جگہ واقع ہوئی تھی کہ ہر کسی کا کسی نہ کسی وقت وہاں سے گزر ضرور ہوتا اور وہ ہمہ وقت اپنی کرسی پر بیٹھی ہوئی انگڑائیاں لیتی رہتی۔ ایسے میں وہ کوئی بارود سے بھرا ہوا غبارہ لگتی۔ جواب پھٹا تو تب پھٹا۔ ایسے میں اگر کسی کی نگاہ غلط بھی اس کی طرف اٹھ جاتی تو وہ اس کو نگاہ ثانی ڈال کر صحیح کئے بغیر وہاں سے نہیں کھسکتا۔

بات یہیں تک محدود نہیں رہی۔ اب اُس کو جب بھی اپنے کام کاج سے تھوڑی

بھی راحت ملتی تو کبھی اس کیبن میں تو کبھی اُس کیبن کے چکر لگانا نہ بھولتی۔ دفتر کی دیگر فیمیل سٹاف کے برعکس اس نے اپنے مرد ساتھیوں سے ہاتھ ملانے بھی شروع کر دیئے۔ ایسے میں اگر کوئی اُسے چائے یا کافی کی دعوت دیتا تو وہ اس کے ساتھ بے تکلف ہو لیتی اور جب وہ وہاں سے لوٹتی تو اپنے چہرے مہرے سے ایسا کچھ ظاہر کرتی جیسے کہ وہ اس سے لنچ کی اُمید کئے رہی ہو۔ غرض یہ کہ ہر کوئی اس کی وسیع الظرفی کا معترف تھا۔

ایک روز رمیش کا پرائیویٹ اسسٹنٹ سندر جو کہ نیلو کا کچھ زیادہ ہی گرویدہ تھا اور کچھ ہی دنوں میں اس کا پورا بایوڈاٹا اکٹھا کر لیا تھا اور اب جو کئی چڑ کے کھانے کے بعد اس سے دور ہی دور رہتا تھا۔ شکایتی لہجے میں رمیش سے مخاطب ہوا۔

''وہ جو اپنے شرما جی ہیں..... جو کہ پتنی کے علاوہ بھی کئی عورتوں سے ملتے ہیں..... ان کے سکوٹر سے بھی کئی مرتبہ...... میں نے نیلو کو اترتے ہوئے دیکھا ہے..... مجھے معاملہ مشکوک لگتا ہے..... سر!..... میاں نکھٹو ہوگا ٹھیک سے..... وغیرہ وغیرہ.....''

چونکہ رمیش کا کیبن بھی جہاں وہ بیٹھتی تھی اس کے آس پاس ہی تھا۔ وہ جب کبھی رمیش کے آس پاس سے گزرتی تو رمیش کی طرف بھی ایک نظر ملتجیانہ ڈالنا نہ بھولتی۔ مگر رمیش اس کو دیکھتے ہی فوراً اپنی نظریں جھکا لیتا اور پھر اپنی فائلوں میں کھو جاتا۔ مگر رمیش اپنے اس رویے پر کچھ زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکا۔ کچھ ہی دنوں میں رمیش سے بھی اس کی ہائے ہلو شروع ہو گئی۔ پہلے تو گفتگو ایک دو منٹ کی ہوتی لیکن جلد ہی منٹوں سے گھنٹوں میں تبدیل ہو گئی۔ ان ملاقاتوں میں جہاں دنیا جہان کے مسائل زیرِ گفتگو آتے وہیں نیلو مردوں کی ہوسناکیوں اور اپنی ساتھی عورتوں کے کریکٹر پر بھی انگلیاں اٹھانا نہ بھولتی جس کو رمیش بڑی خاموشی سے سنتا اور اس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہتا۔ دھیرے دھیرے نیلو خود ان عورتوں کے رابطے میں آ گئی۔ جن کے بارے میں وہ خود کہا کرتی تھی کہ دفتر ان کے لئے محض بہانہ ہے

اصل میں تو وہ.....

ایک روز آفس تقریباً اوور ہونے کے قریب تھا۔ وہ رمیش کے پاس پہنچ گئی اور بڑبڑانا شروع کر دیا۔ کہنے لگی کہ

''آج لنچ کی بات ہے..... مسز کھنہ شاپنگ کے لئے جا رہی تھی، مجھے بھی اپنے بچے کے لئے سکول کے جوتے لینے تھے..... میں ان کے ساتھ ہو گئی۔ جانے کو تو میں چلی گئی مگر!..... جب میں وہاں سے واپس لوٹی تو ہر کوئی مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا..... مسز منگیری نے تو حد ہی کر دی..... انہوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ..... یہ تم نے کس کا ساتھ پکڑ لیا ہے یہ تو بڑی ہی ''خراب'' عورت ہے..... تمہیں پتہ نہیں ہر کوئی جانتا ہے..... اس کے شوہر کو بھی پتہ ہے..... بھلا آپ ہی بتایئے کہ کسی کی ذاتیات پر اتنے وثوق سے کسی کو انگشت نمائی کا کیا حق ہے..... کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ شوہر سب کچھ جانے اور کچھ نہ کہے..... میرا تو کافی دنوں سے ان کے ساتھ اٹھنا، بیٹھنا ہے..... میں نے تو کبھی کوئی ایسی ویسی بات محسوس نہیں کی.....''

نیلو جب تک رمیش سے باتیں کرتی رہی۔ رمیش بس اُس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ رمیش نے جب دیکھا کہ نیلو کی بات ختم ہونے کو نہیں آ رہی ہے تو اُس نے صرف اتنا کہا۔

''مجھے بھی مسز منگیری کی بات پر بڑا تعجب ہو رہا ہے.......'' پھر وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب نیلو کے لئے بھی وہاں سے اٹھنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہ گیا۔

دوسرے روز نیلو صبح ہی رمیش کے کیبن میں آ گئی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ شاید کل کے واقعہ کو نہیں بھولی ہے۔ رمیش سے کہنے لگی۔

''زمانہ کتنا ایڈوانس ہو گیا ہے اور ہم لوگ وہی لکیر کے فقیر ہیں۔۔۔ میری نند کا دیور رمیش جس کی ۳ سال قبل شادی ہوئی ہے....... اس کو ایک بچہ بھی ہے....... اس کی

بیوی بھی کافی خوبصورت ہے....... جہیز بھی کافی ملا ہے....... پھر بھی وہ دہلی میں ایک لڑکی کے ساتھ عشق فرما رہا ہے....... وہ جب بھی دہلی جاتا ہے تو اس لڑکی کے پاس ہی ٹھہرتا ہے....... میری پڑوسن مسز شیکھر جن کو دورانِ طالب علمی اپنے ہی کلاس کے ایک لڑکے سے عشق ہوگیا....... اب وہ لڑکا نوکری کی غرض سے اسی شہر میں ہی قیام پذیر ہے جیسے مسٹر شیکھر گھر سے آفس کے لئے نکلتے ہیں..... وہ لڑکا ان کے گھر میں آجاتا ہے...."

اس طرح اور بھی بہت سے واقعات نیلو نے رمیش کو سنائے۔ جس پر رمیش نے کوئی خاص ردعمل ظاہر کرنے کی بجائے صرف اس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔

ایک روز کا واقعہ ہے، رمیش اپنے کیبن سے کسی کام سے نکلا ہی تھا کہ نیلو نے اپنی آنکھوں کے اشارے سے اُسے بلایا۔ رمیش اس کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ آج نیلو سیاہ رنگ کا چوڑے گلے کا سوٹ زیب تن کئے ہوئے تھی اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ اپنی کرسی پر ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے بریزیر کے باوجود اس کی چھاتیوں کا نصف بالائی حصہ صاف نظر آرہا تھا۔ رمیش کی پلکیں غیر ارادی طور پر اس کی طرف اٹھ جاتی تھیں اور نیلو سب کچھ جانتے ہوئے بھی خود کو انجان ظاہر کر رہی تھی جیسے اس کو کچھ خبر ہی نہ ہو۔ نیلو نے اپنی گفتگو میں رمیش کو کچھ اس طرح سے پھنسایا کہ وہ وہاں سے ہٹ بھی نہیں سکتا تھا۔ رمیش کے سامنے اپنی سٹوڈنٹ لائف کا وہ منظر گھوم گیا۔ جب وہ اپنی پڑھائی سے اکتا کر کناٹ پیلیس کے چکر لگایا کرتا تھا۔ جہاں پر اور چیزوں کے علاوہ وہ راجستھانی لڑکیاں رمیش کی توجہ کا خاص مرکز بنتیں، جو لہنگے چولی میں ملبوس زمین پر بیٹھ کر کپڑے پر بنی پینٹنگز بیچا کرتی تھیں۔ اگر کوئی گاہک ان کی پینٹنگ کو دیکھ کر بے التفاتی کا مظاہرہ کرتا اور جانے لگتا تو وہ جھٹ آگے کو کچھ زیادہ جھک کر بڑی اضطراری سے اپنی پینٹینگوں کو الٹ پلٹ کر دکھانا شروع کر دیتی تھیں۔ جس کی وجہ سے ان کی چھاتیاں ان کی ڈھیلی ڈھالی چولیوں میں سے جھانکتی شروع کر دیتیں۔ ایسے میں اگر گاہک کی خواہش سامان نہ لینے کی بھی ہوتی تو وہ

کچھ دیر کے لئے ان کے سینوں کے ابھاروں میں کچھ اس طرح سے کھو جاتا کہ ان لڑکیوں کی اوّل جلول حرکتوں کو انہیں کچھ دیر کے لئے برداشت کرنا ہی پڑتا۔

نیلو رمیش سے کہنے لگی۔

"آج مجھے آپ سے ایک ضروری بات کہنی ہے....... مگر مجھے کہتے ہوئے شرم بھی محسوس ہو رہی ہے......." رمیش نے نیلو کی باتوں کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"شرمائے کی کوئی بات نہیں ہے....... نیلو اگر تم مجھے اپنا دوست سمجھتی ہو تو جو کچھ بھی کہنا چاہتی ہو....... بلا تکلف کہہ دو......."

وہ کہنے لگی۔

"میرے شوہر کی کوئی قاعدے کی جاب نہیں ہے....... سکریپ کا کام کرتا ہے....... اگر مل گیا تو ٹھیک....... ورنہ ہفتوں مہینوں بیکار بیٹھا رہتا ہے۔ مجھے جو یہاں سے پیسے ملتے ہیں....... اس کا زیادہ تر حصہ ہاؤسنگ لون میں چلا جاتا ہے اور جو تھوڑے بہت بچ جاتے ہیں اس کے بہت سارے مصارف ہیں....... بڑی مشکل سے گھر کا خرچ چلتا ہے....... چہ جائے کہ کچھ اور بھی ہو....... ادھر کچھ دنوں سے میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی ہے....... میری پیٹھ کمر اور گردن میں مسلسل درد رہتا ہے جس کی وجہ سے میرا ایک جگہ پر کچھ دیر کے لئے بیٹھنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ کئی مقامی ڈاکٹروں کو بھی دکھایا مگر بے فائدہ وہ مجھے آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ جانے کے لئے کہتے ہیں۔ میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں وہاں جاؤں۔ پھر نیلو خاموش ہو کر رمیش کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔

رمیش نے دل ہی دل میں سوچا مطلب صاف ہے کہ نیلو کو مجھ سے پیسے چاہئیں۔

"رمیش نے پوچھا کتنے پیسے؟......."

"۵ ہزار....... میں بس ایک دو مہینے میں آپ کو لوٹا دونگی......."

نیلو نے جواب دیا۔ رمیش نے فوری طور پر ہامی تو بھر لی، مگر جب اس نے جیب

کوٹٹولا تو اتنے پیسے نہیں تھے، بہر حال کچھ کم ۵۰۰۰ روپے جو اس نے اپنے کسی ذاتی کام کے لئے پس انداز کیے ہوئے تھے، نیلو کو تھما دیے۔اس کے چہرے پر بشاشت کی لہر سی دوڑ گئی۔اس کے بعد نیلو آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ گئی یا نہیں اس نے ڈاکٹر کو دکھایا یا نہیں رمیش کو کچھ پتہ نہیں چلا اور نہ ہی اس سلسلے میں اس نے نیلو سے کچھ پوچھا ہی۔

ایک روز دورانِ گفتگو رمیش نے نیلو سے پوچھا۔

''نیلو!.....ایک تو آدمی کا اپنا پشتینی مکان ہوتا ہے چلو جہاں پر بھی ہو...... ٹھیک ہے.......اگر تم کو مکان لینا ہی تھا تو آفس کے قریب لیتی جس سے کم سے کم تم کو آمدورفت میں بھی سہولت ہوتی۔ہم لوگ بھی تمہارے یہاں آسانی سے آجا سکتے تھے....''

نیلو بولی۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں....... مگر کیا؟....... کیا جائے؟....... میرا شوہر بڑا ہی شکی مزاج ہے.......ایک تو خود کچھ نہیں کرتا.......اگر میرے پاس کوئی آجائے یا پھر کہیں میں آؤں جاؤں....... تو وہ مجھے شک کی نظروں سے دیکھتا ہے....... میرے گھر کے پاس ہی اس کی بہن بیاہی ہوئی ہے۔۔اس نے یہاں پر گھر لے کر میرے اوپر مزید اُس کا پہرہ بٹھایا ہے.......میں کبھی بھی یہاں پر گھر لینے کے حق میں نہیں تھی.......''

ادھر دھیرے دھیرے رمیش نے ایک بات یہ نوٹ کی کہ نیلو کے اندر دفتر کو لے کر وہ پہلے والی پابندی نہیں رہ گئی۔پہلے وہ جہاں مہینوں چھٹیاں نہیں کرتی تھی اب اکثر و بیشتر غائب رہتی اگر آتی بھی تو بے وقت یہی حال جانے کا بھی تھا اور کبھی کبھی تو ڈیوٹی کے دوران بھی باہر نکل جایا کرتی اور جب ڈیوٹی پر ہوتی تو کام بھی بڑی بددلی سے کرتی۔مگر رمیش نے اس کی اس نئی تبدیلیوں کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔اس نے سوچا ممکن ہے اس کی طبیعت کچھ زیادہ خراب ہو یا پھر اس کے علاوہ بھی وہ کہیں اور کچھ کر رہی ہو۔

ایک روز رمیش نیلو کے پاس سے گزرا تو اس نے اُس کو اپنی سیٹ پر بڑی اداسی کی

حالت میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے، چہرہ لال بھبھوکا اور نتھنے پھڑک رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ خون آنکھ میں اب اترے گا تو تب۔ کہنے لگی کہ کمپنی والوں نے میرے پیچھے جاسوس چھوڑ رکھا ہے۔

''آج میرا شوہر میرے ساتھ ہی اپنے کسی ذاتی کام سے یہاں آیا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دفتر والے اُس پر ٹوٹ پڑیں گے۔ اُس پر سوال پہ سوال داغے جا رہے تھے۔ نیلو گھر سے آفس کے لئے کب نکلتی ہے؟ گھر کب پہنچتی ہے؟ پرسوں بلا اطلاع دفتر سے غیر حاضر رہی۔ آپ کے بقول گھر پر بھی نہیں تھی۔ تو کہاں تھی؟۔ وغیرہ وغیرہ۔ میرے تو پاؤں کے نیچے سے زمین کھسکتی جا رہی تھی۔ میرے شوہر کے چہرے کا رنگ فق ہوتا جا رہا تھا۔ شکر ہے اوپر والے کا کہ انہوں نے وہاں پر مجھے کچھ نہیں کہا۔ ورنہ چاہتے تو....... وہیں ....... الٹے انہی لوگوں کو رگڑے پر رگڑا دیتے رہے....... انہوں نے کہا....... میں نے اپنی بیوی کو دفتر کے لئے ۹ گھنٹے کا وقت دیا ہے۔ ان گھنٹوں میں وہ کہاں جاتی ہے؟...... کیا کرتی ہے؟....... مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں....... اگر وہ ۹ گھنٹے سے لیٹ ہوتی ہے تبھی میں اُس کو کچھ کہوں گا۔ میرے شوہر کی باتیں کو سن کر شکایتیوں کا چہرہ اتر گیا مگر شام کو میرے گھر پہنچنے پر اس نے جم کر میری خبر لی......''

بہر حال نیلو کے ساتھ رمیش کی باتوں و ملاقاتوں کا سلسلہ چلتا ہی رہا مگر رمیش اب اس فکر میں زیادہ رہنے لگا کہ وہ نیلو سے کس طرح اپنے پیسے واپس لے مگر نیلو تھی کہ ان ملاقاتوں میں رمیش سے سب باتیں تو کرتی مگر پیسے کا کبھی ذکر نہیں کرتی۔ ایک روز رمیش اپنے دل پر جبر کر کے بڑے ہی شرمائے ہوئے لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔

''نیلو!....... مجھے پیسے کی ضرورت ہے....... کسی کو دینے ہیں....... کافی دن ہوئے ان پیسوں کو.......''

نیلو کے حواس باختہ رہ گئے جیسے کہ وہ یہ سب کچھ رمیش کے منہ سے سننا نہ چاہتی

تھی....... مصنوعی مسکراہٹ اپنے چہرے پر لا کر صرف اتنا بولی۔

''ابھی تو نہیں....... اگلے مہینے تنخواہ ملنے پر دے دوں گی.......''

رمیش اب نیلو کی لغویات کو سننے کی بجائے بڑی شدت سے اس دن کا انتظار کرنے لگا جب اسے اپنے پیسے واپس ملیں گے۔ آخر وہ دن آیا، گزر بھی گیا۔ مگر اس نے رمیش کو پیسے تو لوٹانا دور ملاقات پر اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ رمیش خاموش ہی رہا۔ اس طرح پھر کئی مہینے اور گزر گئے۔ ایک روز رمیش ہی خود اس کے پاس پہنچ گیا اور بولا۔

''بات کو سنجیدگی سے لو....... نیلو!....... اور میرے پیسے واپس کر دو.......''

وہ ادھر اُدھر کے بہانے تراشنے لگی اور پھر بولی۔

''کل ضرور لے آؤں گی.......''

کل بھی آیا اور گزر گیا۔ مگر وہی بات دوسرے روز وہ عین لنچ کے وقفہ میں اس کے پاس پہنچا۔ نیلو ہمیشہ کی طرح بجی سنوری تیر کمان بنی ہوئی بیٹھی تھی۔ رمیش کو دیکھتے ہی اس نے انگڑائی پر انگڑائی لینی شروع کر دی۔ پاس ہی پڑی کرسی پر اس نے رمیش کو بیٹھنے کا اشارہ کیا جب رمیش بیٹھ گیا تو پہلے تو اُس نے اپنے آگے پیچھے نظر دوڑائی اور پھر بڑی آہستگی سے رمیش کے کان کے پاس اپنا منہ لے جا کر بولی۔

''کیا پیسے ہی لیں گے؟.......''

☆☆

# خودکشی

جب میں کبھی اخبارات ورسائل میں اس طرح کی خبریں پڑھتا یا اپنے آس پاس میں ہی سنتا کہ فلاں نے عشق میں ناکام رہنے کے بعد خودکشی کرلی ہے تو میرا دل بلیوں اچھلنے لگتا۔

خودکشی کے ان واقعات سے ایک بات جو میرے سامنے واضح ہوکر آئی وہ یہ ہے کہ عورت اور خودکشی دونوں علت ومعلول یا بالفاظ دیگر لازم وملزوم ہیں یعنی جہاں عورت ہے وہاں خودکشی ہے اور خودکشی کے واقعات سے میرے دل کے اچھلنے یا اس میں گدگدی پیدا ہونے کی اہم وجہ یہ ہے کہ خودکشی کے اس عمل میں جو قطعیت وتیقن پایا جاتا ہے وہ دنیا کے کسی دوسرے عمل میں کم ہی دیکھا جاتا ہے۔ ہر جگہ تذبذب، کشش وپنچ ہے۔ ہاں ،نہیں ممکن، ناممکن دونوں ہی پہلو ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور اکثر وہی چیز غالب آجاتی ہے، جو ہماری اُمید کے برعکس ہوتی ہے۔ جہاں تک خودکشی کا سوال ہے تو کوئی شخص اس کا خلوص دل سے ارادہ کرتا ہے تو اگر ایک بار میں نہیں تو دوسری بار اور تیسری بار میں تو کوئی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی ہے کہ آدمی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو۔

خود میری اب تک کی پوری زندگی ہی تذبذب، کشش وپنچ وامید وبیم میں ہی گزری تھی۔ میں نے اپنے بارے میں ایک مرتبہ اپنی ماتا جی کو کسی سے یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ میرا وجود ہی ہاں اور نہیں کے بیچ میں ان کے حمل میں پروان چڑھا۔ پتا جی بالکل نہیں چاہتے تھے

کہ تین بچوں کے بعد کوئی چوتھا بچہ ان کے یہاں پیدا ہو۔

پتا جی نے یہی سوچا کہ اب اسقاط حمل کرا دیں گے تو تب اور اسی طرح سے ۹ مہینے پورے ہو گئے اور میں پیدا بھی ہو گیا۔ والدین کے تذبذب و پس و پیش کے اس رویے نے میری بعد کی زندگی میں بھی میرا کسی طرح سے پیچھا نہیں چھوڑا۔ وہ جو کہتے ہیں کہ ماں باپ کی سوچ کا بچوں کی زندگی پر بھی اثر پڑتا ہے۔ وہ میرے اوپر بالکل صحیح صادق آ رہا تھا۔ میں نے اپنی اب تک کی زندگی میں کسی بھی چیز کو سنجیدگی یا پھر اس کو یوں کہہ لیجئے کہ پورے یقین یا وثوق کے ساتھ لیا ہی نہیں اگر مل گئی تو ٹھیک، نہ بھی ملی تو کوئی بات نہیں یعنی میری پوری زندگی ہی جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں۔ تذبذب، کشش و پنج و امید و بیم کے درمیان گزری۔

سونی سے میرا ملنا اور جدا ہونا بھی میری افتاد طبع کے عین مطابق ہی ہوا۔ اس سے میری ملاقات اس وقت ہوئی جب میں انٹرنیشنل لا میں ایم۔ اے کرنے کے لئے سوامی دیانند یونیورسٹی میں پہنچا میرا داخلہ وہاں ہونے کو تو ہو گیا۔ مگر کوشش بسیار کے باوجود گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے مجھے ہوسٹل میں جگہ نہیں مل سکی۔ ماتا جی نے مجھے یونیورسٹی جاتے وقت دور کی ایک مامی کے بارے میں بتایا تھا جو اسی شہر ہی میں رہتی تھیں۔

چونکہ میری جان پہچان کا کوئی اور تو وہاں پر تھا نہیں۔ فوراً مجھے مامی کا خیال آیا اور میں اپنا مختصر سا سامان لے کر اُن کے یہاں پہنچ گیا۔ میں نے جب مامی کو ماتا جی کا حوالہ دیا تو وہ بہت زیادہ خوش ہوئیں۔ ماما جی بنک میں کیشئر تھے جو گھر سے ۳۰۔۴۰ کلو میٹر دور شہر میں واقع تھا۔ وہ عام طور سے ہفتہ میں اتوار کے روز ہی گھر آتے تھے۔ مامی کے تین بچے اور تھے۔ بڑی بیٹی کی شادی ہو چکی تھی اور ایک لڑکا ساتویں میں پڑھتا تھا اور چھوٹی لڑکی جس کا نام دویہ تھا، یو۔ کے۔ جی میں پڑھتی تھی۔ میں دن بھر یونیورسٹی میں رہ کر کلاس کرتا اور پھر کلاس سے فارغ ہو کر لائبریری چلا جاتا جو یونیورسٹی کیمپس میں ہی واقع ہوئی تھی اور رات گئے تک گھر لوٹتا۔

مامی کے یہاں جب میرے چار۔ چھ مہینے گزر گئے تو ایک اتوار کو جب گھر کے تمام ہی لوگ کسی شادی میں شریک ہونے کے لئے گئے ہوئے تھے تو میں نے ان کے گھر کے آس پاس کا چھت پر چڑھ کر اور کھڑکیوں سے تاک جھانک کا پورا جائزہ لیا۔ مجھے جلدی مامی کے بغل کے مکان میں جو فیملی رہتی تھی ان کے ساتھ ایک لڑکی کے ہونے کا احساس ہوا۔ میرے لئے اس کی صورت شباہت اور پھر وہ گھر سے باہر بھی نکلتی ہے یا نہیں اس کا پتہ لگانا ذرا مشکل تھا۔ کیوں کہ میں خود صبح تڑکے ہی یونیورسٹی کے لئے نکل جایا کرتا تھا۔ دوسری طرف میں نے اُس کو کبھی مامی کے یہاں آتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا۔ ممکن ہے وہ میری غیر موجودگی میں آتی بھی رہی ہو۔

ایک دن کی بات ہے میری طبیعت کچھ خراب تھی، میں اندر سے بخار سا محسوس کر رہا تھا۔ مامی کو جب پتہ چلا تو انہوں نے مجھے یونیورسٹی جانے ہی سے ہی منع کر دیا۔ مگر مجھے گھر میں اکیلے پڑا رہنا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں یہ کہہ کر کلاس چلا گیا کہ اگر طبیعت ٹھیک رہی تو کوئی بات ہی نہیں ہے ورنہ میں بیچ میں ہی یونیورسٹی سے لوٹ آؤں گا۔ ہوا ایسا ہی میں نے چند ایک کلاسیں کیں میری صحت نے میرا ساتھ نہیں دیا اور میں لامحالہ واپس گھر آ گیا۔ میں جب گھر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ مامی کپڑے کی سلائی وکٹائی کے کاموں میں لگی ہوئی ہیں۔ چھوٹی لڑکی دویہ کلاس سے لوٹ کر گھر آ چکی تھی اور وہیں آس پاس ہی میں کود پھاند رہی تھی۔ مامی نے مجھ سے پوچھا کہ کچھ کھانے کی خواہش ہے۔ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کے باوجود بھی انہوں نے دویہ سے کہا۔

''فرج میں انڈا پڑا ہے........ تم آنٹی کے یہاں جاؤ اور سونی سے کہنا......وہ فرائی کر دے گی...... میں بہت زیادہ مشغول ہوں......''

دویہ نے جب فرج میں سے انڈا نکال لیا۔ تو میں نے اس سے کہا کہ ذرا مجھے دکھانا اور پھر میں نے انڈے کو اس کے ہاتھ سے لے کر اس پر سکیچ سے ''آئی لو یو'' لکھ

دیا۔ظاہر ہے یہ کام بڑا خطرناک تھا کچھ بھی ہوسکتا تھا۔دو یہ انڈا لے کر چلی گئی اور میں آنے والی مصیبت کا اپنا دل پکڑ کر انتظار کرنے لگا۔

دو یہ کچھ ہی دیر میں انڈا فرائی کروا کر واپس آگئی ۔اب اس کے ہاتھ میں انڈا فرائی کے ساتھ ساتھ ایک بڑا سا سیب بھی تھا۔دو یہ کہنے لگی۔

''دیدی نے مجھے دیا ہے۔۔۔''میں نے اس سے کہا۔

''نہیں.......یہ اُس نے تم کو نہیں بلکہ مجھے دیا ہے.......''ہم دونوں سیب کو لے کر آپس میں چھینا جھپٹی کر رہے تھے۔دو یہ سے میری یہ سب باتیں گھر کے آنگن میں ہو رہی تھیں اور چونکہ ان دنوں آنگن، گھر و گھر کی دہلیز کے مقابلے تھوڑا انچا ہوا کرتا تھا۔سونی یہ سارا تماشا اپنے گھر کی دہلیز سے پاؤں اچکا اچکا کر دیکھ رہی تھی۔ بلکہ کسی حد تک سن بھی رہی تھی۔بہر حال بات آئی گئی ختم ہوگئی۔

اب جب کبھی مجھے بھی تھوڑا بہت موقع ملتا تھا تو میں خود بھی مامی کے گھر کی دہلیز کے پاس سے اسے گردن اچکا کر اس کی حرکات وسکنات پر نظر رکھتا۔جس کو وہ کسی حد تک محسوس بھی کرلیتی،مگر وہ بس گردن جھکائے ہوئے بغیر کسی ردعمل کے دیکھتی رہتی جس سے میں اس کے دل میں اپنے تیئں دلچسپی کا کسی حد تک اندازہ کرنے لگا تھا۔

ایک اتوار کی بات ہے میں گھر پر ہی تھا۔سونی مامی کے یہاں آگئی۔رنکو اور دو یہ بھی گھر پر ہی تھے اور آتے ہی مامی کے ساتھ شروع ہوگئی۔

''آج یہ ڈش بنائی ہے.....تو وہ ڈش بنائی ہے..... ممی گھر پر نہیں ہیں۔صبح ہی صبح چاچو کو دیکھنے کے لئے نکل گئیں.....ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔پاپا اس ہفتہ ڈیوٹی سے نہیں آئے.....''

میں مقامی کالج میں پڑھتی ہوں۔میرا فرسٹ ائر کا امتحان اگلے مہینے کی پانچ تاریخ سے شروع ہونے والا ہے۔آج کالج میں فنکشن ہے،گھر میں کوئی نہیں ہے،اس لئے

میں نہیں جاؤں گی وغیرہ وغیرہ غرض کہ ایک ہی سانس میں اس کے منہ میں جو بھی کچھ آیا اس اس نے بول دیا۔

اس کی گفتگو سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ یہاں کے مقامی کالج میں پڑھتی ہے اور بی۔ اے فرسٹ ائر کی سٹوڈنٹ ہے۔ مگر اس سے دو بدو ملاقات کیسے ہو۔ یہ بات میری سمجھ سے باہر تھی۔ میں نے سوچا کہ آج اس کے گھر میں کوئی نہیں ہے، موقع غنیمت ہے۔ پھر میں نے جلد ہی جب مامی اپنے کام میں مشغول ہو گئیں تو انڈے کے بعد پہلی مرتبہ کاغذ کے ایک ٹکڑے پر کچھ الم غلم لکھ کر دو یہ کو دیا کہ سونی کو پہنچا دے۔ وہ اسے سیب لینے کے لئے بلا رہی ہے۔ کاغذ کے اس ٹکڑے میں بات کچھ ایسی ویسی نہیں تھی جس پر کہ میری کسی طرح سے بھی کوئی گرفت ہوتی۔ اُس روز تو اُس نے کاغذ کے ٹکڑے پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا مگر بعد میں میری طرف سے بھیجے گئے کاغذ کے ان ٹکڑوں کا اس کی طرف سے باقاعدہ جواب آنے لگا۔ یہ سلسلہ کافی دنوں تک چلتا رہا۔ بعد میں پہلے سے پروگرام طے کر کے میں نے اس کے کالج کے راستے میں ہی اس سے ملاقات کی۔ ہم دونوں کی یہ ملاقات بہت ہی عجیب وغریب تھی۔ میں نے پہلی مرتبہ اس کو اتنے قریب سے دیکھا تھا۔ سانولی سلونی رنگت، بھرا بھرا سا جسم، دلکش چہرہ، بڑی بڑی سیاہ پلکیں، سڈول بازو، سینوں کا ابھار ٹھیک سے نمایاں نہیں تھا۔ ہم دونوں کو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کہ سالوں سے سوکھی پڑی زمین کو پانی کی کوئی پھوار مل گئی ہو۔ میری کنپٹی میں خون کی گردش تیز سے تیز تر ہو گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ اب پھٹ جائے گی تو تب۔ بہر حال اس روز ہماری ملاقات بہت مختصر رہی۔ وہ اپنے کالج کی طرف چلی گئی اور میں یونیورسٹی آ گیا۔

اس کے بعد ہم دونوں اکثر پہلے ہی سے پروگرام بنا لیتے اور پھر ملتے۔ اس نے جلد ہی میرے بارے میں اپنی کالج کی سب سہیلیوں کو بہت کچھ بتا دیا۔ بلکہ اس نے کئی ایک سے ملوا بھی دیا۔ سب کی سب......

''چندے آفتاب چندے مہتاب......''

سونی سے میرے تعلقات کا کسی حد تک میری امی کو بھی پتہ چل گیا مگر انہیں کب اپنے کام سے ہی فرصت تھی۔ انہوں نے بس یہی سوچا کہ آپس میں پڑھائی کی باتیں کرتے ہونگے۔ بہر حال یہ سلسلہ قریب قریب دو سال تک چلا۔ شہر کا شاید ہی کوئی ایسا کیفے، گیسٹ ہاؤس یا ریسٹورنٹ باقی بچا ہوگا جس میں، میں سونی کے ساتھ اپنا کچھ وقت نہ گزارا ہو۔ میں اُس کی وسیع الظرفی و وسیع الخیالی کا معترف ہو چکا تھا۔ میں ہمیشہ ہی بوجھل قدموں اور پراگندہ ذہن کے ساتھ ان کیفوں و ریسٹورینٹوں میں جاتا اور جب میں سونی کے ساتھ وہاں سے لوٹتا تو خود کو تازہ دم، شگفتہ و شاداب محسوس کرتا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے کے سونی کے بدن میں کوئی جادو ہو جس سے کہ اس کی قربت کے بعد سے میرے جسم میں جان سی آجاتی ہو۔

سونی نے جیسے ہی بی۔اے مکمل کر لیا اس کے والدین کو اس کی شادی کی فکر لاحق ہوئی۔ جب بھی وہ اس کی شادی کی بات اس کے سامنے چھیڑتے تو وہ ان لوگوں کے سامنے تو گونگی بن جاتی۔ مگر جب بعد میں اس کی مجھ سے ملاقات ہوتی تو وہ میرے اوپر شادی کا دباؤ بناتی اور میں اسے یہ کہہ کر ٹال دیتا۔

''اگر مجھے نوکری ملی ہوتی تو میں نے کب کی تم سے شادی کر لی ہوتی۔ اگر ابھی میں بفرض محال تم سے شادی کر بھی لوں تو تم کو کھلاؤں گا کہاں سے؟......'' میں سونی سے کھل کر انکار بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ تذبذب نے پھر میرا پیچھا پکڑ لیا......

سونی کی خاموشی کو دیکھ کر اس کی ماں نے اس کی سہیلیوں سے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ کوئی لڑکا ہے کیا جس سے کہ سونی شادی کرنا چاہتی ہو؟ اس پر سونی کی سہیلیوں میں سے ایک جس کا نام بیتا تھا اور جو ہم لوگوں کے بارے میں سب کچھ جانتی تھی۔ اس نے سونی کی ماں کو پوری بات بتا دی جس میں اس نے خصوصیت کے ساتھ میرا ذکر کیا۔

ایک روز جب میں یونیورسٹی کے لئے نکل رہا تھا اور ابھی بس پکڑنے میں چند فرلانگ ہی باقی رہے ہونگے کہ اس کی ماں جو پہلے ہی سے وہاں موجود تھی۔ اس نے میرا راستہ روک لیا۔ میں گھبرا گیا۔

کہنے لگی۔

"بیٹا..... ہم لوگ شریف آدمی ہیں۔ سونی میری بیٹی ہے اب اس کی شادی کرنی ہے اگر تم سنجیدہ ہو تو صاف صاف بتاؤ تا کہ شادی کے لئے تمہارے والدین سے بات چیت کی جائے....."

میں تو اچانک ان کی ان غیر متوقع باتوں کو سن کر گھبرا سا گیا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں اب زمین پر گروں گا تو تب....."

میں نے کہا۔

"آنٹی..... اس وقت تو مجھے کچھ ضروری کلاسیں کرنی ہیں۔ یونیورسٹی جا رہا ہوں۔ میں پھر آپ سے ملتا ہوں۔ میں کسی طرح سے اس وقت ان سے پیچھا چھڑا کر وہاں سے بھاگا اور پھر میں نے فوراً ہی مامی کو کچھ معقول و کچھ نا معقول وجہ بتا کر ان کا مکان خالی کر دیا اور اپنے ایک کلاس فیلو کے ساتھ جو شروع ہی سے کرائے کے مکان میں رہتا تھا ایڈجیسٹ ہو گیا۔

سونی کی ماں سے تو نہیں مگر سونی سے اب بھی میری کالج کے راستے میں ملاقاتیں ہوتی رہتیں۔ جس میں وہ پہلے کی طرح میرے اوپر شادی کا دباؤ بناتی مجھے میرے جینے و ساتھ مرنے کے وعدے بھی یاد دلاتی اور میں ہمیشہ ہی ٹال مٹول سے کام لیتا۔ مگر سونی کے والدین نے جلد ہی معاملے کو گڈے گڈی کا کھیل نہ سمجھ کر سونی کا کہیں اور رشتہ طے کر دیا۔ اس کے باوجود بھی سونی مجھے ہر لمحہ اپنے گھر کی بدلتی ہوئی صورتِ حال سے آگاہ کرتی رہتی مگر میں بے حس اس قدر ہو چکا تھا کہ میرے کان پر جوں تک نہیں رینگتی اور وہ

وقت بھی آیا کہ سونی کی شادی ہوگئی۔ مجھے پہلی بار ایسا لگا کہ جیسے میں تنہا سا ہوگیا ہوں اور میرے خرمن پر بجلی گر گئی ہو۔ مجھے کسی حد تک خود اپنی ذات سے نفرت سی ہونے لگی تھی۔

سونی کے اگرچہ تمام ہی پیپر ہو چکے تھے مگر اس کو کچھ ضروری اسائمنٹ اب بھی جمع کرنے باقی رہ گئے تھے۔ جس کے لئے وہ کبھی اکیلے تو کبھی اپنے شوہر کے ساتھ کالج آیا کرتی جب وہ اکیلی ہوتی تو کالج کے راستے میں مجھ سے ملنے کی کوشش کرتی جس میں وہ میرا حال چال پوچھتی اکثر وہ مجھ سے کہا کرتی۔

''تم بہت پریشان سے لگتے ہو، بہت دبلے ہوگئے ہو...... اپنی صحت کا خیال رکھا کرو......'' مگر مجھے اس کی یہ سب باتیں فضول لگتیں اب مجھے اس سے ملتے ہوئے گھبراہٹ سی ہوتی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے سونی وہ بھینس ہے جس کو بھینس والا جس کھونٹے سے باندھ دیتا ہے وہ اسی کی ہو کر رہ جاتی ہے۔ ممکن ہے اسے اچھا شوہر مل گیا ہو۔

میں نے بہت جلد فیصلہ کرلیا کہ اب مجھے سونی سے ملنے کا کوئی حق نہیں ہے اور میں نے اب اس پر عمل کرنا بھی شروع کردیا پھر دوسری طرف اب میرا کورس بھی مکمل ہو چکا تھا۔ اب میں نے مزید وہاں پر رکنے کی بجائے اپنے گھر کا رخ کیا اور پھر میں فوراً اپنے گھر پر آ گیا۔

سونی سے میری جدائی کوئی ایسی معمولی بات نہیں تھی جس کو میں آسانی سے بھلا دیتا۔ میں جب بھی اس کی یادوں ملاقاتوں و باتوں میں کھو جاتا تو میرے اوپر ایک بدحواسی کی کیفیت سی طاری ہوجاتی۔ میں نے خود کو تنہا کرلیا بلکہ میں نے اپنی زندگی کو ایک کمرے تک محدود کرلیا۔ گھر کے لوگوں سے بھی میرا ملنا جلنا ضرورت کے مطابق ہی ہوتا۔ ڈپریشن میرے اوپر غالب آ چکا تھا۔ پتا جی اکثر میری اس حالت کی وجہ مجھ سے پوچھا کرتے۔ میں ان کو کیا بتاتا؟

گھر والوں کی طرف سے جب سوال و جواب کا سلسلہ کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تو

میں نے خودکشی کرنے کا فیصلہ کرلیا اور میں نے اپنی گفتگو میں ان لوگوں کو اس بات کا کسی حد تک اشارہ بھی کردیا۔ خودکشی کا خیال میرے ذہن میں آتے ہی میرا دل مچلنے لگا اب اس کا انحصار صرف اس بات پر تھا کہ میں اس کیلئے طریقہ کون سا اپناتا ہوں۔ میں زہر کھانا نہیں چاہتا تھا اس کا پتہ بعد میں میرے گھر والوں کو چلتا اور میں بستر ہی پر پڑا کا پڑا رہ جاتا اور نہ اس میں کوئی مہاتی بات ہی تھی۔ یہی حال ندی میں کودنے کا بھی تھا۔ اسی طرح میں خود سوزی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ میں ادھ جلا بچالیا جاتا اور پھر میں نہ مروں نہ جیوں کی کیفیت میں مبتلا رہتا۔ لے دے کے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یا تو میں ٹرین کے آگے کود جاؤں یا پھر سیلنگ فین سے رسّی کا پھندا باندھ کر لٹک جاؤں۔ بعد میں میں نے ٹرین کے آگے کودنے کے فیصلے کو اس لئے ملتوی کردیا چونکہ ٹرین کا گزر میرے گاؤں کے آس پاس کہیں تھا نہیں اس کے لئے مجھے بڑا لمبا سفر کرنا پڑتا جس کے لئے گھر والوں کی طرف سے سوالات پر سوالات شروع ہو جاتے۔ اگر میں حیلے بنانے سے وہاں پہنچ بھی جاتا اور تھوڑی دیر کے لئے مان لوں کہ اس واقعہ کو انجام بھی دے دیتا۔ تو ایسی حالت میں میرے جسم کے پرخچے اُڑ جاتے۔ پہلی بات تو یہ کہ میری خودکشی کی خبر ہی میرے گھر والوں تک نہیں پہنچتی اور اگر بفرض محال پہنچ بھی جاتی تو لے دے کے پھر وہی زہر خوری والی حالت سے مختلف نہیں ہوتی۔

چنانچہ میں نے آخرالذکر طریقے کو ہی مناسب وموزوں سمجھا کہ سیلنگ فین سے ہی لٹک کر جان جان آفریں کے حوالے کردونگا اور اس کے لئے میں نے دن رہتے ہی ساری تیاریاں کرلیں اور جب رات کو اس واقعہ خاص کو انجام دینے کے لئے اپنے کمرے میں پہنچا تو میرا ڈوگی جمی بھی میرے پیچھے پیچھے، میرے کمرے میں آگیا۔ اس نے میری غیر متوقع حرکات وسکنات کو دیکھ کر زور زور سے بھونکنا شروع کردیا۔ مجھے پہلی مرتبہ اس بات کا احساس ہوا کہ جانور بھی اتنے زیادہ حساس ہوتے ہیں۔

میں نے اُس کو بہت خاموش کرنے کی کوشش کی میں نے اس کی طرف کئی بسکٹ کے ٹکڑے بھی پھینکے مگر وہ پھر بھی خاموش نہیں ہوا۔اس کے بعد فوراً ہی ممّی آ گئیں اور ممّی کے ساتھ میری بہن کالڑ کا چنٹو ،منٹو اور پھر بات پتا جی کو بھی معلوم ہو گئی۔

ان لوگوں نے پہلے تو یہ جاننے کی کوشش کی کہ آخر میں اس طرح کی حرکت کیوں کر رہا ہوں۔میں تو خاموش ہی رہا مگر میرے کچھ قریبی دوستوں نے انہیں سب کچھ بتا دیا ۔انہوں نے مجھے بہت سمجھایا کہ ایک لڑکی کے چکر میں پڑ کر اپنی جان کو ختم کرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔جان سلامت رہے گی تو تم کو ہزاروں لڑکیاں مل جائیں گی۔مگر سونی کسی بھی حال میں مجھ سے بھلائی نہیں جاتی تھی مجھے اس کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات کاٹ کھانے کے لئے دوڑتے تھے۔میرے پتا نے میرے لئے لڑکی کی کھوج شروع کر دی۔اسی بیچ میں ایک بار پھر میں اس واقعہ کو اس وقت انجام دینے کی کوشش کی جب ممّی پاپا کسی کی شادی کی تقریب میں شرکت کرنے کے لئے گئے ہوئے تھے۔میں نے عزم مصمم کر لیا کہ آج میں اپنی اس کوشش کو کسی بھی طرح سے رائیگاں نہیں جانے دوں گا۔میں نے پہلے تو کرسی پر چڑھ کر سیلنگ فین سے رسّی باندھی اور اس کے بعد رسّی کا پھندا بنا کر اپنی گردن میں ڈال لیا اور جیسے ہی کرسی کو اپنے پاؤں سے ایک طرف کو دھکا دیا۔غالباً رسّی بہت کمزور تھی میرا بوجھ برداشت نہ کر سکی اور پھر میں فوراً ہی زمین پر دھڑام سے آ گرا۔شور سن کر فوراً ہی بغل کے کمرے سے چنو ،منٹو دوڑے۔یہی نہیں جب انہوں نے میری گردن میں پھنسا ہوا پھندا دیکھا تو وہ دونوں پوری بات سمجھ گئے اور پھر ان دونوں نے زوروں سے چلانا شروع کر دیا۔ آس پڑوس کے لوگ بھی اکٹھے ہو گئے اور پھر ممّی پاپا جیسے ہی گھر آئے ان کو لوگوں نے سب کچھ پہلے ہی بتا دیا اس بار انہوں نے مجھے سمجھانے بجھانے کی بجائے فوراً ہی لاتوں و گھونسوں سے میری خبر لینی شروع کر دی اور اس وقت تک میری خبر لیتے رہے جب تک کہ وہ دونوں تھک نہیں گئے اور میں بے ہوش ہو کر زمین پر گر نہیں پڑا۔

رات کو سوتے وقت، میں نے اپنے دل میں پختہ ارادہ کرلیا کہ اب جب بھی قدم اٹھاؤں گا پوری تیاری اور احتیاط کے ساتھ چاہے اس میں اب تھوڑا وقت ہی کیوں نہ لگے اور اب یہ عمل آخری ہی ہوگا۔ میں ابھی اس کی تیاری میں ہی لگا ہوا تھا کہ میرے پاپا اور ممی نے چشتی دکھاتے ہوئے ایک گنوار اور کوڑھ مغز لڑکی سے میری شادی کر دی۔ اور پھر بچہ بھی پیدا ہوگیا۔ کچھ ہی دنوں میں سونی کی یاد میرے ذہن سے بالکل محو ہوگئی۔ اب میں روز پھانسی کے پھندے پر چڑھتا ہوں اور اترتا ہوں۔ میں ان تمام نامراد ناکام عاشقوں کی قسمت پر رشک کرتا ہوں جن کی روحیں ہمہ وقت مجھے گھورتی رہتی ہیں اور میں اپنا دل مسوس کے رہ جاتا ہوں۔

# چوہیا

انوراگ فطرتاً خاموش طبیعت اور کچھ شرمیلا بھی واقع ہوا تھا۔اس وجہ سے جہاں اسے بہت کچھ اپنے والدین ورشتے داروں کی طرف سے محرومی کی شکل میں برداشت کرنا پڑا وہیں کالج اور پھر بعد میں یونیورسٹی لائف میں اُس کو اپنی ان عادتوں کا خمیازہ کچھ کم نہیں بھگتنا پڑا۔کیونکہ اس کے گھر والے ہوں یا رشتے دار بہر حال یہ اُس کے اپنے تھے جو اس کی ان عادتوں سے بخوبی واقف تھے اور اس لحاظ سے اس کی جائز و ناجائز ضرورتوں کا خیال رکھتے تھے مگر کالج و یونیورسٹی میں کسی کو کیا پڑی تھی جو اس کی ناز برداریاں کرتا۔انٹر کرنے کے بعد جب وہ شہر کے ڈگری کالج میں پہنچا تو یہاں کی فضا اس کے گاؤں کے اسکول و کالج کے برعکس اسے بدلی ہوئی نظر آئی۔ یہاں پر اس کا جنس لطیف سے بھی سابقہ پیش آیا۔ایسا نہیں تھا کہ اس کو جنس لطیف سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی بلکہ اس کی خاموش طبیعت اور اس کے شرمیلے پن نے اس کا یہاں بھی پیچھا کیا۔دوسرے لڑکے جن کو پڑھنے لکھنے سے تو کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی وہ شکل وصورت کے لحاظ سے ہی کچھ خاص تھے بازی مار گئے۔ کنچن جو اس کی کلاس فیلو ہی تھی اور اس نے کئی بار جانے انجانے میں اس پر ڈورے بھی ڈالے تھے۔مگر انوراگ نے اس سے بات تو دور اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا اور وہی ہوا جس کی کہ پہلے ہی سے امید تھی۔ سریش جو اس کا کلاس فیلو ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا ہم وطن بھی تھا اور جس کو پڑھنے لکھنے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اور جس کا کالج میں

داخلے کا واحد مقصد ہی غالباً لڑکیاں پٹانا تھا۔ وہ یہاں بھی مورچہ مار گیا اور کنچن کو لے اُڑا۔

انوراگ کو اس کا پتہ اس وقت چلا جب کنچن کی مسلسل کلاس سے غیر حاضری کے بعد ایک روز اس نے اسے سریش کے ہوسٹل سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا اور پھر یار دوستوں نے بتایا کہ وہ اب کلاس میں حاضری دینے کی بجائے سریش کے ہوسٹل ہی میں حاضری لگاتی ہے۔ سریش دن بھر بستر پر پڑا رہتا اور کنچن اسے انواع و اقسام کی ڈشز بنا کر کھلایا کرتی۔

یہ تو تھا کالج کی کنچن کا معاملہ، جب وہ یونیورسٹی میں پہنچا تو جیا نے کلاس ،لائبریری، کینٹین، بس سٹینڈ نہ جانے کہاں کہاں نہ اس کا پیچھا کیا اور وہ تھا کہ ٹس سے مس نہ ہوا، بعد میں تھک ہار کر وہ ایک گنجے کی محبت میں گرفتار ہوگئی۔ پھر ان دونوں نے شادی بھی رچالی اب ان کو ایک بچہ بھی ہے۔

جمائیکا سے اس کی ملاقات یونیورسٹی کے بس سٹینڈ پر ہوئی۔ پہلی ہی ملاقات میں وہ انوراگ کی پرکشش شخصیت اور اس کے ہاؤ بھاؤ سے اتنی زیادہ متاثر ہوئی کہ اس نے فوراً ہی اس کا ایڈریس لے لیا اور ایک دو روز بعد ہی ایک دوپہر جب انوراگ ہوسٹل کے ڈائننگ ہال سے کھانے سے فارغ ہو کر اپنے کمرے کی طرف آرہا تھا تو اس نے دیکھا کہ جمائیکا اس کے ہوسٹل میں پہنچی ہوئی ہے اور اس کے کمرے کے عین سامنے ہی کسی سے اس کے کمرے کا پتہ پوچھ رہی ہے۔ وہ تیزی سے جمائیکا کی طرف لپکا اور اسے فوراً اپنے کمرے میں لے گیا۔ اس کو جہاں اس بات کا خوف ستا رہا تھا کہ کہیں کوئی اور نہ جمائیکا کو اس سے اچک لے وہیں یہ بات بھی اس کو پریشان کر رہی تھی کہ اگر کہیں یار دوستوں نے جنہوں نے اس کو لڑکی سے بات کرنا تو دور کبھی اس کی طرف نظر اٹھا کے دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھا ہے۔ آج تن تنہا ایک لڑکی کے ساتھ اسے دیکھ کر کیا سوچیں گے؟ وہ خود تنہائی میں ایک لڑکی کو اپنے اتنے قریب پا کر کچھ پریشان سا تھا۔ اس نے بمشکل جمائیکا کو ڈائننگ ہال سے کھانا لا

کر کھلایا، وہ کئی گھنٹے تک اس کے کمرے میں رکی رہی ۔ مختلف موضوع پر گفتگو ہوئی ۔ وہ انوراگ کی زبان سے کچھ پیار و محبت کی بات سننا چاہتی تھی ۔ مگر انوراگ کے دل و دماغ میں تو بس یہی بات گردش کرتی رہی کہ وہ اس کے کمرے سے اب جائے تو تب جائے ۔

بالآخر جمائیکا انوراگ کی عدم دلچسپی کو دیکھ کر پھر ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوگئی ۔ گھبراہٹ میں انوراگ اس کو باہر چھوڑنے کے لئے بھی نہیں نکلا ۔ جمائیکا چلی گئی تو انوراگ کو کچھ جان میں جان آئی ۔

جمائیکا ایک دو روز بعد صبح ہی صبح پھر اس کے روم پر پہنچ گئی ۔ ابھی لڑکے اپنی کلاسوں میں بھی نہیں گئے تھے ۔ اسے کافی گھبراہٹ ہو رہی تھی کہ کہیں اس کا کوئی ساتھی اس کے کمرے کی طرف نہ آ نکلے ۔

اس مرتبہ اس نے جمائیکا کو کمرے میں بٹھانے کی بجائے باہر ٹہلنے کی دعوت دی اور پھر وہ دونوں فوراً بس سٹینڈ پر پہنچ گئے ، ساؤتھ ایکس ، کناٹ پیلیس ، پلازہ نہ جانے کہاں کہاں ان دونوں نے چکر مارے ، جمائیکا موقع بموقع انوراگ کے دماغ کو ٹٹولنے کی کوشش کرتی رہی ۔ مگر وہ تھا کہ اس سے بے اعتنائی ہی برتتا رہا ۔

اب شام ہو چکی تھی اس نے دوبارہ پھر جمائیکا کو اپنے ہوسٹل میں لانے کی بجائے اُدھر ہی سے اُدھر اس کو اس کے گھر کے لئے بس پکڑا دی اور پھر وہ تن تنہا اپنے ہوسٹل پہنچا اور اطمینان کی سانس لیا ۔

تیسری مرتبہ جمائیکا اس کے کمرے میں اس وقت آدھمکی جب لڑکے بالے دوپہر کا کھانا کھا کر اپنے کمرے میں آرام کر رہے تھے ۔ دھوپ کی شدت سے ہر چیز تپ رہی تھی ۔ انوراگ نیند کی آغوش میں ہی جانے کی تیاری کر رہا تھا ۔ اس کو ذرا غصہ بھی آیا کہ یہ بھی کوئی کسی کے یہاں آنے کا وقت ہے ۔ مگر اس نے ضبط سے کام لیا ۔

جمائیکا بستر کے پاس ہی پڑی کرسی پر بیٹھ گئی ۔ اس نے باتوں ہی باتوں میں

مختلف ڈھنگ سے انوراگ کو ٹٹولا اور ڈھکے چھپے لفظوں میں اپنی محبت کا اظہار بھی کیا مگر انوراگ تھا کہ اس کے دل ودماغ میں جمائیکا کی یہ باتیں گھس ہی نہیں رہی تھیں۔ وہ دو تین گھنٹے کی اکتا دینے والی گفتگو کے بعد وہاں سے جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ انوراگ اُس کو رخصت کرنے کے لئے بستر سے اٹھا اور جیسے ہی کمرے کی چٹخنی کھولنے کے لئے اس نے اپنے ہاتھ کو اوپر بڑھایا جمائیکا نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اب وہ دونوں دروازے کے عین سامنے کھڑے تھے۔ جمائیکا نے اس کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال دیں۔ انوراگ کو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کہ وہ آنکھوں کے راستے اسے نگل جائے گی۔

جمائیکا نے اپنا دوسرا ہاتھ انوراگ کی شرٹ میں ڈال دیا۔ اس کے ہاتھ کبھی انوراگ کے سینے پر تو کبھی اس کے پیٹ پر پھرنے لگے۔ جمائیکا کے ہاتھ کے لمس سے انوراگ کے جسم کی سبھی نسیں ستار کے تاروں کی طرح تن گئیں۔ مگر انوراگ بے حس وحرکت جمائیکا کی ان کریہہ وناپسندیدہ حرکتوں کو یہ سوچ کر برداشت کرتا رہا کہ وہ اس کے کمرے سے اب باہر نکلے گی تو تب۔ مگر ادھر جب جمائیکا نے دیکھا کہ اب بھی انوراگ کے موڈ میں کوئی تبدیلی نہیں آرہی ہے تو وہ آخری حربے کے طور پر انوراگ سے یوں مخاطب ہوئی۔

''کیا آپ مجھے...... اٹھا سکتے ہیں؟...... ''

لاجا شرما انوراگ بولا۔ ''کیوں نہیں؟...... ''

پھر دوسرے ہی لمحہ انوراگ نے جمائیکا کو اپنی بانہوں میں بھر کر اوپر اٹھا لیا اس کا پیٹ انوراگ کے پیٹ سے اور اس کی نرم وگداز چھاتیاں انوراگ کے سخت وسپاٹ سینے سے جیسے ہی ٹکرائیں وہ گدگدی سے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس نے جب دیکھا کہ انوراگ کے جسم میں اب بھی کوئی گرمی پیدا نہیں ہوئی تو وہ انوراگ سے یوں مخاطب ہوئی۔

''رہنے دیجئے..... میں بہت بھاری ہوں..... '' اور پھر فوراً ہی اس نے بڑی بدمزگی سے خود اپنے ہاتھوں سے کمرے کی چٹخنی کھولی اور یہ جا وہ جا ہوگئی۔

انوراگ نے بہت ہی زیادہ کشیدہ موڈ میں اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا اور پھر فوراً ہی اپنی خوابوں کی دنیا میں کھو گیا۔

آج جب وہ تھکا ہارا ہوا اپنی کلاس سے واپس آیا اور جیسے ہی ڈائننگ ہال میں کھانے کے لئے بیٹھا اس کی اپنے کسی دوست سے کسی بات کو لے کر بحث ہو گئی اور بحث نے اتنا طول پکڑا کہ کھانے کا عمل تو رک گیا لیکن بحث اختتام کو نہیں پہنچی۔ جب انوراگ نے اپنے کمرے کی راہ لی تو اس کے اس دوست نے وہاں بھی اس کا پیچھا کیا۔ کمرے میں بھی کافی دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ بحث جب کچھ سرد پڑی اور اس کے دوست نے اس سے رخصت لی تو انوراگ نے کچھ راحت محسوس کی۔ وہ ابھی کمرہ بند کرنے کے لئے اٹھنے ہی والا تھا کہ جمائیکا نے گیٹ پر دستک دی۔ پھر وہ کسی مزاحمت کے ہی روم میں داخل ہو گئی اور اس کے پاس ہی بستر پر بیٹھ گئی اور پھر کچھ دیر بعد ہی اس نے دیوار کا سہارا لے کر اپنے پاؤں پسار دیئے۔ انوراگ کچھ گھبرا گیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھنا ہی چاہتا تھا کہ جمائیکا اس کے اوپر چڑھ بیٹھی اور اسے اپنے بازوؤں میں دبوچ کر خونخوار بلی کی طرح اس کے بالوں، ہونٹوں کو اپنی زبان اور اپنے ناخنوں سے نوچنے لگی۔ اس نے خود کو اس کی گرفت سے آزاد کرانے کی بہت کوشش کی مگر ناکام ثابت ہوئی۔

انوراگ کی عدم دلچسپی کو دیکھ کر کچھ ہی لمحوں میں وہ پشیمان اس کے پہلو میں آکر بیٹھ گئی اور پھر وہ فوراً ہی بستر سے اٹھ پڑی اور کمرے میں بڑی بے چینی سے ٹہلنے لگی۔ پھر انوراگ سے یوں مخاطب ہوئی۔

''آپ کے پاس پریس ہے......''

''ہے تو مگر...... کیا کرنا ہے؟......''

''اگر میں اپنے ان مڑے تڑے کپڑوں کے ساتھ گھر جاؤں گی تو ممی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی کہ دال میں کچھ کالا ہے......''

انوراگ نے ہاتھ بڑھا کر جمائیکا کو پریس دی۔ پھر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی قمیص وشلوار اتار کران پر پریس کرنے لگی۔

انوراگ جو بوریت کے عالم میں اب کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ جمائیکا کو ٹو پیس میں دیکھ کراس کے تن وبدن میں برقی لہری دوڑنے لگی جب تک پریس کرتی رہی۔ انوراگ اس کے کندن جیسے دمکتے بدن کو بغور دیکھتا رہا۔ کپڑوں پراب پریس کا عمل مکمل ہو چکا تھا۔ اس نے فوراًہی اپنے کپڑے زیب تن کئے اور ہاتھ کے اشارے سے انوراگ کو"پھرملیں گے"۔

کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہرنکل گئی۔

جمائیکا کمرے سے جاچکی تھی۔ مگرانوراگ ابھی بھی اسکے بدن کے تصور میں گھویا ہوا تھا کہ اچانک پوسٹ مین کی آمد نے سکوت کوتوڑا۔ اس کے بعد کئی دنوں تک بلکہ ہفتوں تک جمائیکا انوراگ کے کمرے میں نہیں آئی۔

ایک شام جب وہ لائبریری سے اپنے ہوسٹل کی طرف آرہا تھااور قریب تھا کہ اپنے کمرے میں داخل ہواچانک اس نے جمائیکا کواپنے بغل کے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ جمائیکا نے ناک سکوڑ کرایک کریہہ سی آواز نکالی اورفوراًہی آگے کو بڑھ گئی۔ انوراگ کوایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کہ وہ کوئی مری ہوئی چوہیا ہو۔

☆☆
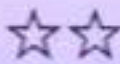
# دھچکا

ترلوچن نے جیسے ہی کاشی وِدیا پیٹھ سے ڈپلوما ان ماس میڈیا کا کورس مکمل کیا۔ اسے وہاں کے ہی ایک ہندی روزنامے میں سب ایڈیٹر کی نوکری مل گئی۔ چونکہ اخبار کی زیادہ تر خبریں باہر سے انگریزی میں آتی تھیں۔ اس لئے آفس میں زیادہ کام ترجمے کا ہی تھا۔ جن کی کمپوزنگ کے لئے کئی کمپوزر تھے۔ جن میں اکثریت لڑکیوں کی تھی جو اپنے گھروں میں رہ کر اپنے شوہروں کا انتظار کرنے کی بجائے یہاں نوکریاں کیا کرتیں اور جیسے ہی کوئی مناسب لڑکا ان کو مل جاتا وہ نوکری کو الوداع کہہ دیتیں۔

ترلوچن کو اپنے حصّے کا کام کروانے کے لئے جو لڑکی ملی اس کو آفس کے کام، دھام سے کم اور اپنی ظاہری تزک بھڑک سے کچھ زیادہ ہی دلچسپی تھی۔ ترلوچن چونکہ فطرتاً سادہ مزاج واقع ہوا تھا۔ اس لئے وہ اس کی بے جا تزک بھڑک کو پسند نہیں کرتا تھا مگر چونکہ اس میدان کا وہ نیا شہسوار تھا اور اس میدان میں اُسے ٹکنا بھی تھا اس لئے وہ یہاں پر ''تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو'' کے مصداق تماشائی بنا رہتا۔

انہی دنوں جب وہ اپنی سیٹ پر براجمان ہوتا تو وہ چوڑی دار پاجامے اور گھیرے دار فراک میں ملبوس ایک دبلی پتلی لڑکی کو اکثر و بیشتر اپنے ایڈیٹر انچیف کے چمبر میں جاتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔

کچھ ہی دنوں میں ترلوچن کو پتہ چلا کہ وہ لڑکی جس کا نام پرجیت ہے کو بطور کمپوزر

اسی آفس میں رکھ لیا گیا ہے۔ پھر اس کو اتفاق ہی کہئے کہ اس نے ترلوچن کی ہی ماتحتی میں کام بھی کرنا شروع کر دیا۔ یہ معمولی خدو خال کی لڑکی تھی جس کا چہرہ سلیٹ کی طرح جذبات سے عاری تھا۔ نہ ہنسی، نہ خوشی، نہ غم۔ اس کے کام کرنے کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ نوکری کی کچھ زیادہ ہی ضرورت مند ہے۔ اگر وہ کبھی کام کرنے کے دوران کسی سے بقدر ضرورت بات بھی کرتی تو اس کا دھیان اپنے کام پر ہی ہوتا۔

وہ جب بھی اپنے کام میں مشغول ہوتی تو ترلوچن دزدیدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا کرتا۔ وہ کرسی پر اپنے دوپٹے سے اپنے جسم کو کچھ اس انداز سے ڈھانپ کر بیٹھتی تھی کہ اس کے جسم کا کوئی بھی حصّہ چہرے و ہاتھ کے علاوہ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ اتنی زیادہ دبلی تھی کہ اس کے چہرے کی ہڈیاں باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ اس سے ایسا لگتا تھا کہ گوشت اندر کو دھنس گیا ہے۔ جبکہ اس کے برعکس اس کے دونوں ہاتھ بہت ہی زیادہ خوبصورت و پرکشش تھے۔

لمبی لمبی انگلیوں جن کے ناخنوں کو وہ بڑے ہی دلکش انداز میں تراشے ہوئے رکھتی جس سے یہ اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں تھا کہ اس کی انگلیاں کتنی زیادہ نرم و ملائم ہونگی۔ ترلوچن کا اب تک کا یہ تجربہ تھا کہ اگر لڑکی کے ہاتھ خوبصورت اور دلکش ہیں تو اس کا چہرہ بھی یقیناً ہی خوبصورت ہوگا اور اپنے اس تخمینے میں وہ خود کو اس پینٹر کا ہم پلہ خیال کرتا تھا جو پاؤں دیکھ کر ہی پورے جسم کی کیفیت بتا دیا کرتا تھا۔ واقعہ یوں ہے کہ:

''ایک راجہ اپنی رانی کی پینٹنگ بنوانا چاہتا تھا۔ اس نے ایک پینٹر کو بلوایا جب پینٹر حاضر خدمت ہوا تو اس نے کہا کہ ہماری رانی کی ایک پینٹنگ بناؤ۔ مگر ایک شرط ہے کہ میں تم کو رانی کی صورت نہیں دیکھنے دونگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب سے وہ راج محل میں آئی ہے اس کی صورت کسی غیر مرد نے نہیں دیکھی ہے۔ پینٹر تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد راجہ سے بولا۔

''ایک صورت ہو سکتی ہے...... آپ ان کا پاؤں ہی دکھا دیجئے...... صرف پاؤں سے ہی اندازہ لگالوں گا۔ راجہ نے اس کی یہ بات منظور کرلی، پینٹر نے پاؤں دیکھ کر ہی پوری پینٹنگ بناڈالی۔ یہی نہیں اس نے ایک کاریگری یہ کی کہ اس نے رانی کے زانو پر تل کا نشان بھی بنادیا۔ راجہ کو پینٹنگ بہت پسند آئی، لیکن اس نے ایک اعتراض یہ کیا کہ تم نے رانی کے زانو پر تل کا نشان کیوں بنایا ہے؟ اس پر پینٹر نے کہا کہ رانی کے زانو پر تل موجود ہے۔ چنانچہ جب راجہ نے رانی کا زانو دیکھا تو اس پر اُس کو واقعی تل نظر آیا۔ اس پر راجہ کو پینٹر پر شک ہوا کہ کہیں...... وغیرہ وغیرہ۔''

قصہ کوتاہ مگر یہاں ترلوچن کا تخمینہ غلط ثابت ہو رہا تھا۔ ترلوچن کے ذہن کو کہیں نہ کہیں یہ چیز کریدتی کہ پرجیت کے ہاتھ اس کی انگلیاں اتنی زیادہ خوبصورت ہیں تو چہرہ اتنا زیادہ بھدا اور بدصورت کیوں ہے؟

پرجیت نے بھی بہت جلد اس بات کو محسوس کرلیا کہ ترلوچن کی نگاہ کو اس کے سراپا میں کسی چیز کی تلاش ہے۔ لہٰذا اب وہ اپنی نشست برخاست میں بھی بڑا احتیاط برتنے لگی اور ترلوچن کی اپنی ذات سے بے جا دلچسپی کو کراہیت کی نظر سے دیکھتی اور کبھی کبھی تو اپنی زبان سے اس کا برملا اظہار بھی کردیا کرتی تھی۔

ادھر ترلوچن نے بھی محسوس کرلیا کہ وہ لڑکی جو ہر وقت اپنے کام میں لگی رہتی تھی اب وہ بہت جلد اپنے کام سے اکتا جایا کرتی ہے بلکہ کچھ پریشان سی بھی رہتی ہے۔ ترلوچن جیسے ہی آفس میں قدم رکھتا پرجیت گھبرا جایا کرتی اور جب ترلوچن اُس کو کچھ کرنے کے لئے کہتا تو کہتی۔

''جلدی کیا ہے...... ابھی تو کافی وقت باقی ہے......''

''آپ کی گھبراہٹ سے کسی کی جان بھی جاسکتی ہے؟......''

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ترلوچن اسے کوئی اہم خبر ڈکٹیٹ کروا رہا تھا۔ وہ بیچ ہی میں

رک گئی کہنے لگی۔

''میرے کانوں میں بہت ساری مختلف آوازیں ایک ساتھ گونج رہی ہیں۔ مجھے آپ کی باتیں صاف سنائی نہیں دے رہی ہیں...... آپ کسی اور کو دیکھ لیجیے......''

ترلوچن نے اس روز تو اسے اس کے حال پر ہی چھوڑ دیا اور اونے پونے کر کے اپنے کام کو ختم کیا۔ دوسرے روز بھی اس نے کام کرتے کرتے ایسی ہی حرکت کی۔ اس روز ترلوچن نے اسے سخت دھمکی دی۔ مگر ترلوچن کی باتوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ بلکہ وہ الٹا بول پڑی۔

''جس سے بھی شکایت کرنی ہے...... کر دیں...... مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے......''

اب یہ عالم ہو گیا کہ ترلوچن جیسے ہی آفس میں قدم رکھتا اور اس کو کچھ کام کرنے کے لئے دیتا اسی وقت وہ یہ کہہ دیتی۔

''میرا موڈ نہیں ہو رہا ہے...... میں نے شائنہ سے کہہ دیا ہے کہ وہ آج آپ کو اٹین(ATTAIN) کر لے گی۔ مگر شائنہ ترلوچن کو کب اٹین(ATTAIN) کرتی جبکہ اس کے پاس اپنے ہی کام کا بوجھ کچھ کم نہیں ہوتا......''

جب اس کی یہ حرکت ترلوچن کے لئے ناقابل برداشت ہو گئی تو ترلوچن نے ایک بار اپنے باس سے اس کی شکایت بھی کر دی۔

انہوں نے اس سے پوچھا۔

''کیا پرابلم ہے؟...... کیوں نہیں کام کر رہی ہو؟...... جاؤ کام کرو......''

پھر وہ ترلوچن سے مخاطب ہوئے۔

''آپ کو اسی سے کام چلانا ہے...... میرے لئے ہر آدمی کو اس کی من مرضی کا کمپوزر فراہم کرنا ناممکن ہے......'' پھر وہ لڑکی ترلوچن کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اس روز بھی

اس نے بمشکل ہی کچھ کیا۔

ایک مرتبہ بات بہت آگے بڑھ گئی۔اس کی ہٹ دھرمی کو دیکھ کر ترلوچن کی زبان سے نکل گیا۔

''شاید تم ...... اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ میں اپنا کام تم سے ہی کروانے کا خواہش مند ہوں...... اگر ایسا ہے تو اپنے ذہن سے اس بات کو کرید پھینکو......''

پر مجیت اس بات سے بہت زیادہ بھڑک گئی۔جیسے کہ ترلوچن نے اس کی عزت پر دھاوا بول دیا ہو۔اس نے پلٹ کر ترلوچن پر وار کر دیا۔

''آپ نے کیسے یہ اندازہ لگالیا؟ ...... یہ میرے اوپر سراسر الزام ہے...... آپ کو اس طرح کی فضول باتیں اپنے منہ سے نکالنے سے پہلے کچھ سوچنا بھی چاہئے...... وغیرہ وغیرہ......''

ایک روز ترلوچن جیسے ہی آفس میں داخل ہوا تو اس نے پر مجیت کو اپنے مزاج و معمول کے برعکس ایک لپاٹیئے قسم کے لڑکے کے ساتھ محو گفتگو دیکھا۔ترلوچن کو اچھا نہیں لگا۔اس کے پہنچتے ہی وہ لڑکا وہاں سے کھسک گیا۔پہلے تو ترلوچن نے اس کو کمپوزنگ کے لئے میٹریل دیا پھر اسی دوران اسی سے مخاطب ہوا۔

''دیکھو پر مجیت!...... میں اس لپاٹیئے کی نس نس سے واقف ہوں...... تمہیں اس سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے...... ایسا نہ ہو تم اس کے داؤ پیچ میں آجاؤ......'' ترلوچن کی ان باتوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔وہ جوں کی توں اپنے کام میں لگی رہی۔اس کی سرد مہری کو دیکھ کر ترلوچن وہاں سے ہٹ گیا اور خود بھی اپنے کام میں لگ گیا۔

ایک روز تو اس لپاٹیئے نے حد ہی کر دی۔ترلوچن پر مجیت کو پردھان منتری کے بدیشی دورے کی خبر ڈکٹیٹ کروا رہا تھا وہ درمیان میں ہی وہاں پہنچ گیا۔پھر پر مجیت بھی کام

چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوگئی ۔ترلوچن غصّے میں آپے سے باہر ہوگیا۔ پر مجیت سے مخاطب ہوا۔

''اگر یہی کچھ کرنا ہے...... تو آفس سے کہیں باہر جا کر کرو......'' اور پھر ترلوچن اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ مگر وہ الٹے ترلوچن پر ہی برس پڑی۔

''خود گلچھرّے اڑاؤ تو کوئی بات نہیں ...... میں نے تھوڑی سی بات کیا کرلی...... آپ نے تو پورا آفس ہی سر پر اٹھالیا...... مین مردوں کی فطرت سے بخوبی واقف ہوں ...... اچھا کیا ہے؟ ...... بُرا کیا ہے؟ ...... آئندہ مجھے بتانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے...... میں اپنا اچھا برا خوب سمجھتی ہوں...''

اب ترلوچن اس آفس کے لئے نیا نہیں تھا۔ پر مجیت کی اس غیر متوقع باتوں سے اُسے کافی تکلیف پہنچی۔ ترلوچن نے اب خود کو پر مجیت تک ہی محدود نہ رکھ کر اب جو بھی لڑکی اسے فارغ مل جاتی وہ اس سے اپنا کام کروالیتا بلکہ یوں کہا جائے کہ ترلوچن نے کسی حد تک اس کا بائیکاٹ کردیا جبکہ یہاں پر کچھ ایسے فسادی عناصر بھی تھے جنہوں نے اس معاملے کو غلط جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ ''ان لوگوں کو کچھ دال میں کالا نظر آیا'' وہ سرعام سرگوشی کرتے نظر آتے کہ ترلوچن نے ضرور اس معصوم کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی ہوگی۔ جس کی وجہ سے ہی ان دونوں کے بیچ میں تفریق ہوئی ہے بلکہ یوں کہئے کہ جتنے منہ اتنی ہی باتیں۔

کچھ ہی دنوں میں ترلوچن کی دوری کا یہ اثر ہوا کہ اب پر مجیت خود اس کے انتظار میں رہنے لگی کہ وہ اس کے پاس اپنا کام کروانے کے لئے آجائے۔ پھر ترلوچن نے بھی ایک دو مرتبہ اس کو ٹٹولنے کے لئے اس کی طرف رخ بھی کیا جس کا اس نے مسکرا کر بڑی گرمجوشی سے جواب دیا۔

اب پر مجیت کی ادا و حرکت سے ترلوچن کو لگنے لگا کہ وہ اس کا انتظار کرتی ہے۔ ترلوچن جیسے ہی آفس میں داخل ہوتا وہ اس کی طرف بڑی ہی متجسسانہ نظروں سے دیکھتی کہ

شاید ترلوچن اس کے پاس آجائے۔

کچھ ہی دنوں میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اگر پرجیت کے پاس کوئی کام نہیں ہوتا تو وہ بلا تکلف ترلوچن کے پاس آکر بیٹھ جاتی اور وہ بلاوجہ ہی اس سے باتیں کرنے لگتی اور کبھی کبھی تو وہ ترلوچن کو اس کے نجی معاملے میں بھی اسے مشورے دینے لگتی۔ جس پر وہ خاموشی سے اس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہتا۔

پرجیت کی اس نئی تبدیلی کا اثر یہ ہوا کہ اب ترلوچن کو خود پرجیت کا انتظار رہنے لگا اور یہ سلسلہ کافی دنوں تک چلتا رہا۔ ترلوچن نے ایک خاص بات ان ملاقاتوں میں یہ نوٹ کی وہ یہ کہ دفتر میں جب بھی کسی لڑکی کی شادی ہوتی اور پھر چند دنوں بعد وہ شادی کی رسموں کو نپٹانے کے بعد دفتر پہنچتی تو وہ اس لڑکی کے جوڑے و مہندی لگے ہاتھوں کو دیکھ کر جل بھن جایا کرتی۔ اس کے دماغ پر کئی دنوں تک اس کا اثر رہتا۔

پھر وہ بھی دن آیا کہ ترلوچن کو آفس ہی میں کسی سے پتہ چلا کہ پرجیت کی اسی لپاٹیئے کے ساتھ شادی ہونے والی ہے۔ پرجیت حسب دستورِ قدیم ترلوچن سے ملتی رہی اور حتیٰ الوسع ترلوچن نے بھی یہی ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ وہ اس کی ان باتوں سے بے خبر ہے۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، پرجیت کے رنگ ڈھنگ و پہناوے اڑھاوے میں بڑی تیزی سے تبدیلی آرہی تھی۔ پرجیت جواب تک لمبے دوپٹے میں اپنے جسم کو کچھ اس طرح سے چھپائے رکھتی تھی کہ اس کے جسمانی اعضاء کے بارے میں کچھ بھی اندازہ لگانا ناممکن ہوتا تھا۔ اب وہ اس طرح کے باریک کپڑے زیب تن کر کے آتی کہ اس کے جسم کا ہر خط واضح طور سے نظر آتا تھا۔

آج دفتر میں اس کا آخری دن تھا۔ اس کو دیکھ کر ترلوچن کو ایسا لگا کہ جیسے وہ اپنی خوابگاہ سے اٹھ کر اچانک اس کے پاس آگئی ہو۔ اس کی زلفیں بے ہنگم انداز میں اس کے

شانے پر بکھری ہوئی تھیں۔ دوپٹہ گلے کا ہار بنا پیچھے کو ڈھلکا ہوا تھا۔ سفید بریزیر اپنی جگہ خاص کو چھوڑ کر بہت اوپر کو آ گیا تھا۔

ترلوچن کی نظر کو شدید دھچکا لگا اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے کہ وہ اس کا منہ چڑا رہی ہو......

☆☆

# کوڑھ مغز

''نہیں نہیں ۔۔۔شیلا ضرور کچھ کھیر ہی میں تھا۔ پہلے سے میری طبیعت اتنی خراب نہیں تھی جب سے میں نے کھیر کھائی ہے۔تبھی سے میرا سر چکرا رہا ہے۔'' سنیل ایک لمبی سانس لے کر بڑبڑایا۔

'' آپ کو محض وہم ہے کھیر میں کچھ بھی نہیں تھا...... کیا کبھی پہلے بھی ایسا ہوا ہے جو آج آپ بول رہے ہیں...... آخر بچوں نے بھی کھایا ہے ان کو تو کچھ نہیں ہوا۔ ایسا تو نہیں ہے ہولی قریب ہے...... آفس میں ہی کسی چھا مک چھلو نے آپ کو بھانگ کا پکوڑا کھلا دیا ہو...... ویسے بھی پکوڑا اور لڑکی ہمیشہ سے ہی آپ کی کمزوری رہی ہے...... ''شیلا نے جواب دیا۔

'' پکوڑا تو میں نے ضرور کھایا ہے...... جو ریتا لے کر آئی تھی...... مگر بھانگ کا پکوڑا؟...... مگر وہ مجھ سے ایسا مذاق کیوں کرے گی؟...... ایسا تو کبھی اس نے پہلے کیا نہیں...... تھوڑی دیر کے لئے اگر میں مان بھی لوں کہ میں نے بھانگ کا پکوڑا کھایا ہے......تو وہ دو تین بجے دن کی بات ہے......اگر کچھ ہونا ہوتا تو اُسی وقت ہو جاتا......اس وقت تو رات کے ۱۰ بجے ہیں۔ وہ بھی تمہارے ہاتھوں سے بنی کھیر کھانے کے بعد......''

'' بکواس بند کیجئے......میں کہتی ہوں یہ بھانگ کے پکوڑے کا ہی اثر

ہے...... رات کافی ہو چکی ہے...... مجھے نیند آ رہی ہے...... سونے دیجئے اور آپ بھی سو جایئے......"

"میں مر رہا ہوں...... اور تم کو سونے کی پڑی ہے......"

"آپ تو آفس سے کرسی توڑ کر آتے ہیں...... برتن دھونا، کھانا پکانا، بچوں کو ہوم ورک کروانا پڑے تو پتہ چلے......"

"خیر اس بات کو چھوڑو کہ میری طبیعت بھانگ کے پکوڑے سے خراب ہوئی ہے یا کھیر سے...... تم ذرا ڈسپرین بڑھانا......"

"خود لے لیجئے...... میں اس وقت بستر سے اٹھنا نہیں چاہتی...... اگر ایک مرتبہ میری نیند اچٹ جائے گی تو پھر بڑی مشکل سے آئے گی اور پھر مجھے تڑکے اٹھنا بھی تو ہے۔ آپ تا ۹ بجے تک بستر پر ہی پڑے پڑے انگڑائیاں لیتے رہتے ہیں۔۔۔"

"دیکھو شیلا!...... اتنی لاپروائی ٹھیک نہیں ہے...... میری طبیعت لگاتار خراب ہوتی جا رہی ہے...... میرا بلڈ پریشر بھی لو ہو رہا ہے......"

"میں آپ کی نیچر سے بخوبی واقف ہوں...... آخر میں آپ کو نہیں سمجھوں گی تو کون سمجھے گا...... ۱۵ سال سے جو میں آپ کو جھیل رہی ہوں......"

"تم اتنی احسان فراموش ہو سکتی ہو...... میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا...... پچھلے دنوں جب تم کو ٹائیفائڈ ہو گیا تھا۔ تو میں دفتر سے چھٹی لے کر تمہارے پاس ہی بیٹھا تمہارے ہاتھ پاؤں دباتا رہتا کہ مبادا تم کو کچھ ہو نہ جائے...... بچوں کو تو نانی ممانی مل جائے گی مگر میرا کیا ہوگا؟......"

"بے وقوف کسی اور کو بنایئے گا...... آپ تو صرف یہ جاننے کے لئے میرے پہلو میں بیٹھے رہا کرتے تھے کہ کب میری سانس میرے جسم سے جدا ہوتی ہے اور آپ کب اُس چڑیل کو گھر میں لاتے ہیں......"

''اتنا بڑا الزام!...... شیلا کچھ تو بھگوان سے ڈرو......''

''الزام اور آپ...... میں اپنی ہمت سے اور صرف اپنے بچوں کے لئے بستر مرگ سے اٹھی ہوں...... میری طبیعت تو ابھی بھی خراب ہے...... اور آپ جیسا پاپی شیطان!۔۔۔آپ نے تو مجھے بیماری کی حالت میں بھی...... اس دن سے مجھے آپ سے اور بھی زیادہ نفرت ہوگئی......''

''تمہارا جسم ہی کچھ ایسا ہے......''

''اور مجھ بیمار پر آپ کو ذرا بھی رحم نہیں آیا......''

''فضول کی باتیں بند کرو شیلا!...... میرا سر زوروں سے چکرا رہا ہے...... مجھے لگ رہا ہے جیسے میں اب کچھ دیر کا ہی مہمان ہوں...... آدمی جب خود اچھا ہو تو اُس کو ایسے ہی ہری ہری سوجھتی ہے...... میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم اتنی سنگ دل ہوگی...... افسوس زندگی بھر تو میں نے یہی تبلیغ کی کہ کوئی گھامڑ نگر میں شادی نہ کرے اور خود پھنس گیا۔ خیر چھوڑو ...... ان باتوں کو...... پلیز دوا اُٹھا دو......''

''مجھے نیند آرہی ہے......''

''آخر تم سمجھتی کیوں نہیں ہو...... میں جب مرجاؤں گا...... تب تم سمجھو گی......''

''اگر تم کو مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی تو پھر تم کو مجھ سے شادی کرنے کی ہی کیا ضرورت تھی کسی اور سے کر لیتی...... جس سے تمہیں دلچسپی تھی...... ویسے بھی تمہارے یہاں روایت رہی ہے کہ میٹھا میٹھا ہپ کڑوا کڑوا تھوتھو......''

''اس غلط فہمی میں مت رہئے گا...... میں کبھی بھی آپ سے شادی کرنا نہیں چاہتی تھی...... اور نہ ہی آپ میرے گھر والوں کو ہی پسند تھے...... وہ تو آپ اور آپ کے گھر والے ہی تھے جنہوں نے ہم کو اور ہمارے گھر والوں کو سبز باغ دکھا کر دھوکا دیا......''

''شیلا!...... تم جھوٹ بول رہی ہو جیسے کہ مجھے پتہ ہی نہ ہو......''

''تم خود ہی سی تڑا رہی تھی...... تم کو لے کر تمہارے گھر والے بہت زیادہ پریشان تھے...... وہ خود تمہارا رشتہ لے کر ہمارے یہاں آئے تھے...... تمہارے یہاں کا عالم تو یہ ہے کہ رشتہ طے نہیں ہوتا ہے...... تحفے تحائف شروع ہو جاتے ہیں......''

''خدا کے لئے الزام تراشی سے بچئے...... آپ کی طبیعت ویسے ہی خراب ہو رہی ہے...... ایسے میں کچھ ہو گیا تو خدا کے یہاں بھی بخشائش نہیں ہوگی...... ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم کا کندہ بنے رہئے گا؟......''

''اگر میں جھوٹ بول رہا ہوں...... تو تم خود ہی ایک نظر اپنے گاؤں پر ڈال لو...... وہ...... اور وہ......!!''

''خیر ان باتوں کو چھوڑو...... چلو چنو منو کو ہی جگا دو...... وہ مجھے دیکھ لیں گے......''

''شیلا ارے او شیلا!...... یہ کیا تم تو واقعی سو گئی...... بالکل تم اپنی ماں پر گئی ہو...... وہ بھی تمہارے باپ کو بستر پر اکیلے چھوڑ کر اپنی بچیوں کے بیچ میں آ کر سو جایا کرتی تھی اور ایک رات ایسا ہوا کہ اس بیچارے نے بڑی ہی کسمپرسی کی حالت میں جان جان آفریں کے حوالے کر دی اور صبح تم لوگوں کا پچھاڑیں کھانا تو دیکھتا کوئی...... میں پوچھتا ہوں کہ آخر تمہاری نیند اتنی سخت کیوں ہے؟ پچھلے دنوں جب تم چنو منو کے ساتھ سفر کر رہی تھی اور تم کو ایسے ہی نیند آ گئی اور کوئی تمہارا پرس تمہارے پہلو سے لے اڑا اور تم کو آہٹ تک محسوس نہیں ہوئی۔ اس میں کئی قیمتی جیولری بھی تھی، بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ کوئی تمہارا...... تب بھی تمہارے بدن پر جوں تک نہیں رینگے گی......''

''ارے یہ کیا مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ کسی نے میرے سینے پر منوں وزنی پتھر لا کر ڈال دیا ہو...... اب تو مجھے سانس بھی لینے میں دقت محسوس ہو رہی ہے...... ایک مرتبہ

میں نے باتوں ہی باتوں میں تم سے کہا تھا کہ میری خواہش ہے کہ میرے جسم سے میری جان اس طرح نکلے کہ میرا سر تمہاری گود میں ہو...... جن پر تم نے روہانسی لہجے میں قسمیں کھاتے ہوئے کہا تھا کہ جان!...... میں ایسا بالکل نہیں ہونے دونگی...... آپ کی روح کے آپ کے جسم سے نکلنے سے پہلے ہی میں زہر کھا کر مرجانا پسند کروں گی...... مگر میں شیلا آج تم سے پوچھتا ہوں کہ آخر تمہارے ایک ساتھ جینے مرنے کے وہ وعدے وہ قسمیں کہاں گئیں؟......"

مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے آس پاس کی چیزیں بھی مجھ سے اوجھل ہوتی جا رہی ہیں۔

"ارے یہ کیا؟...... اب تو مجھے الٹیاں بھی آنی شروع ہو گئیں...... شیلا کیا تمہیں الٹیوں کی آوازیں نہیں سنائی دے رہی ہیں۔ اب میں کچھ دیر کا ہی مہمان ہوں...... تم جب صبح کو نیند سے بیدار ہو گی یا پھر ممکن ہے کہ تم چنومنو کی وجہ سے ہی درمیانی رات کو جاگو اور مجھ کو مرا ہوا پاؤ...... مگر میں تمہاری نیچر سے بہت ٹھیک سے واقف ہوں تم یہ کہہ کر پھر سو جاؤ گی کہ اتنی رات کو پڑوسیوں کا جگانے کے لئے گھر کو سر پر اٹھانا فضول ہے اور پھر تم سو جاؤ گی اور یہ کام صبح پر ٹال دو گی۔ تم پڑوسیوں کو اکٹھا کرنے کے لئے چیخو گی۔ چلاؤ گی، بیان کر کر کے روؤ گی...... اے کاش! اس وقت کوئی تمہاری مکاری کو سمجھتا اور ہاں میرے مرنے کے بعد اپنے ہاتھوں کی چوڑیاں اور اپنے ناک کی ثانیہ مرزا کٹ نتھنی کبھی مت اتارنا۔ مجھے سونے ہاتھ اور سونی ناک بالکل پسند نہیں ہیں۔ کئی کٹنیاں اس فکر میں ہونگی کہ وہ تمہارے ہاتھوں کو چوڑیوں سے اور تمہاری ناک کو نتھنی سے محروم کردیں۔

"شیلا!...... تم بالکل کوڑھ مغز ہو...... کاش تھوڑی سی بھی عقل تمہاری کھوپڑی میں ہوتی تو تم میری اس جاکنی کی حالت میں سونے کی بجائے اس وقت میرے پہلو میں

سوگوار بیٹھی ہوئی ہوتی...... افسوس!......"

یہاں پر کوئی کاغذ بھی نہیں ہے...... کم سے کم اس پر دستخط ہی کر دیتا...... تمہارے لئے نہیں اپنے بچے چنو، منو کے لئے ہی سہی...... آہ!...... آخری وقت میں، میں نے ان معصوموں کا چہرہ تک نہیں دیکھا...... صبح جب وہ مجھے مرا ہوا پائیں گے......تو ان کے دلوں پر کیا گزرے گی......اف!...... یہ ٹائل لگا گوڈریج کے فرنیچر سے سجا گھر، بنک بیلنس، شیئرز، کہیں میرے بعد ان پر کوئی اور دعویدار نہ کھڑا ہو جائے...... مانا کہ کچھ بھی نہیں ہوگا...... مگر کچھ دیر کے لئے تو تم کو کورٹ کچہری کے چکر میں ڈال ہی دے گا۔ ان لمحات میں تم میری موت کا ماتم کروگی کہ ان چکروں میں پڑوگی......"

"خیر ان باتوں کو چھوڑو۔۔کوئی دعویدار کھڑا ہو نہ ہو۔۔چنو ہی کون سا شرافت کا پوتلا ہے کوئی اسے ہی چڑھا بڑھا دیگا۔ آج کل کے لڑکے ویسے ہی اخلاقیات سے عاری ہوتے ہیں...... اگر وہ تم کو اپنے ہی پیارے گھر سے بے گھر کر دیگا تو تم اس کا کیا کرلوگی؟...... یہ فکر مجھے اس لئے بھی کھائے جا رہی ہے کہ ان چیزوں پر تمہارا ہی حق ہے۔ تم نے میرے دہکتے جسم کو ٹھنڈک بخشی کیا میرا کچھ بھی فرض نہیں بنتا ہے...... میں نہیں چاہتا کہ میرے بعد کوئی اوران چیزوں سے عیش کرے اور تم منہ دیکھتی رہو!......"

جہاں تک میرے سگے سمبندھیوں کا سوال ہے تو تم ان سے مطمئن رہنا ان کے دل و دماغ میں یہ بات ہے کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ ان سے تم کو گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ میرے اس آخری وقت میں بھی غیر جانبدار رہیں گے......وہ کوئلے میں ہاتھ محض کالا کرنے کے لئے نہیں ڈالیں گے...... وہ دور ہی سے تماشا دیکھیں گے......اور ہاں میری بوڑھی بے چاری ماں اس نے کس طرح سے مجھے انٹر کرایا اور اس کلرکی کی نوکری کے لئے بیچاری نے اپنے کانوں کی بالیاں تک بیچ ڈالیں۔ کتنے پیار سے کہتی تھی یہ تمہارے باپ کی میرے پاس اب یہ آخری نشانی بچ گئی ہے...... مگر

افسوس کہ تم سے شادی کے بعد تمہارا دباؤ میرے اوپر کچھ اس قدر بڑھا کہ پہلے جو میں کبھی کبھاران کو ۱۰۰/۵۰ روپے منی آرڈر بھی کر دیا کرتا تھا۔ وہ بھی چھوڑ دیا مبادا تم ناراض ہو جاؤ...... خیر ان باتوں کو چھوڑو...... میں مکان میں سے نہیں کہتا...... بنک بیلنس اور شیئرز میں سے بھی نہیں میری پینشن جو پوری تم کو ہی ملے گی...... اس میں سے زیادہ نہیں بلکہ کچھ ہر ماہ میری ماں کو دے دیا کرنا...... ان کی دعائیں میری بخشش اور جنت میں میرے داخلے کا سبب بنیں گی۔

اور ہاں یہ میری کتابیں جن کو میں نے دورانِ طالب علمی اپنے پاکٹ خرچ میں سے کٹوتی کر کے خریدی ہیں اور پھر تم کیا جانو کہ مجھے پاکٹ خرچ ہی کتنا ملتا تھا...... اگرچہ جس دن سے تم میری قسمت سے جڑی ہو۔ میں اسی دن سے تم سے کہتا رہا ہوں...... شیلا کتابیں پڑھا کرو...... مطالعہ سے دماغ طبق در طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ آدمی کے اندر کچھ کرنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ مگر تم ہمیشہ وہی مثل ثابت ہوئی...... بھینس کے آگے بین بجائے، بھینس کھڑی پگرائے...... تم ان کو گندگی فضول کی جگہ گھیرنے والی چیزیں ہی سمجھتی رہی...... تم ہمیشہ یہ دلیل دے کر میرے اوپر حاوی ہوتی رہی کہ میرے بھائی نے بھی انجینیر نگ کی ہے...... نہ اُس وقت اُس کے پاس کتابیں تھیں نہ اب ہیں...... کتابیں خریدنے اور پڑھنے کا مرض تو آپ کو ہی ہے...... شیلا میں یہ باتیں تم سے اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ان کتابوں کو تم ردّی کے بھاؤ مت بیچنا...... تم کو اپنے میکے سے دودھ میں مکھی کو ملنے کا نتیجہ ملا ہے...... تم سوچو گی جو ہی ساٹھ وہی باٹھ......''

کتابیں علم و بصیرت کا وہ مینارہ نور ہوا کرتی ہیں جو اپنے جویاؤں کو بصیرت فراہم کرتی ہیں۔ میری یہ کتابیں کسی مقامی کالج کو میرے نام سے ہدیہ کر دینا۔ علم و ہنر کے جویا اس سے اپنی پیاس بجھائیں گے اور یہ میرے حق میں صدقہ جاریہ ہوگا (یہ الگ بات ہے کہ اس میں کچھ چوری کی بھی ہیں)...... تم کو اس کے لئے الجھن میں پڑنے کی ضرورت نہیں

ہے...... تم کسی کالج والے کو بس ایک کال کر دینا وہ خود ہی اٹھا کر لے جائیں گے......
ہاں آخر کس طرح کوئی آدمی مرجاتا ہے تو اس کے رشتے داروں کی محض ایک کال پر آنکھیں
نکالنے والے مردے کے پاس پہنچ جاتے ہیں اور آنکھیں نکال کر لے جاتے ہیں۔

''شیلا میں سمجھتا ہوں میرے بعد تمہارا پردیش میں بال بچوں کے ساتھ قیام کرنا
مشکل ہوگا تم پردیش چھوڑ دینا...... مگر میکے کی بجائے اپنے سسرال کو ہی اپنی مستقل
قیام گاہ بنانا...... جہاں پر دکھی سکھی جیسے بھی رہوگی کوئی طعنہ دینے والا نہیں ہوگا......
عزت، وقار قائم رہے گا۔ تمہارے میکے میں تمہاری عزت ''گھر کی مرغی دال برابر'' بھی نہیں
ہوگی اور پھر وہ تمہارا میکہ جہاں مفت خورے گدھوں کے جھنڈوں کی طرح ہمہ وقت
منڈلاتے رہتے ہیں کہ کہاں مال غنیمت نظر آئے اور وہ اس پر ٹوٹ پڑیں...... میرا ہم
زلف (جس کو اس وقت ہم زلف کہتے ہوئے میرا خون کھول رہا ہے...... مگر کیا کیا
جائے، رشتہ بھگوان کے گھر سے اترتا ہے...... اس میں تبدیلی ناممکن ہے) کو میری موت
کی خبر سب سے بعد میں دینا میرے مرنے پر سب سے زیادہ اسی کو خوشی ہوگی ۔۔۔ اس کا
جب ذکر آتا تھا تو میرے سسر بڑے ہی فلسفیانہ انداز میں کہا کرتے تھے۔''

''بعض صحبتیں سم قاتل ہوا کرتی ہیں...... اگر تم کسی کو ناپسند کرتے ہو تو اُس کو
دور ہی رکھو...... پانی کی مستقل بوند سے پتھر کی سل بھی گھس جاتی ہے...... یہ ناممکن ہے کہ
آدمی آدمی کے ساتھ رہے اور اس سے متاثر نہ ہو...... ہم نے اُس کو اپنے گھر میں آنے
جانے کی اجازت اس لئے دے رکھی تھی کہ ہمارے گھر میں کوئی باہر کا کام دھندا کرنے والا
نہیں تھا...... مگر وہ کچھ اتنا ہی زیادہ شاطر نکلا کہ میری بیٹی تو بیٹی میری بیوی کی بھی آنکھوں
پر سحر کر ڈالا...... میں چلاتا ہی رہ گیا کہ نوکر اور داماد میں فرق ہونا چاہئے...... مگر
نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے...... انجام کار وہ میری بیٹی کا ہاتھ لے بیٹھا......
ظاہر ہے کہ اس نے میری عزت میں چار چاند لگانا کیا تھا اس نے خود اپنا قد بڑھایا ہے

...... پھر ہوا وہی جو ہونا تھا، چیل کے گھونسلے میں مانس کہاں...... اب پچھتاوٗ کیا ہوت ہے...... ایسے میں شیلا اس کو مفت خوری کا ایک اور اڈہ مل جائے گا میرے جیتے جی اس کے جو منصوبے پورے نہیں ہو سکے...... اس کو پورا کرنے کی کوشش کرے گا......''

''میری مال و متاع جو اب تمہاری ہے اس کو بھی ہڑپنے کی کوشش کرے گا...... چنو منو، کو وہ غلام بنا ڈالے گا...... اور یہی نہیں وہ میری پیاری یادوں کو بھی تمہارے ذہن سے محو کرنے کی کوشش کرے گا...... نہیں میں ایسا بالکل نہیں ہونے دونگا......''

اچانک میرے منہ سے زور کی چیخیں نکلتی ہیں...... میں اب تک جو چت لیٹا ہوا تھا، سنبھل کر بیٹھ جاتا ہوں...... میری چیخوں سے شیلا تھوڑا کسمساتی ہے پھر وہ حسب معمول ناک بجانے لگتی ہے...... چنو منو نیند سے بیدار ہو جاتے ہیں اور دونوں، دونوں طرف سے میرے پہلوؤں میں آ کر بیٹھ جاتے ہیں...... میری حالتِ زار کو دیکھ کر وہ مجھے سوالیہ نظروں سے گھورتے ہیں...... میں بڑے ہی زوروں سے دونوں کو ہی اپنی بانہوں میں بھینچ لیتا ہوں...... ویسے ہی جیسے کے کوئی مرغی چیل کی ظالم نظر سے اپنے بچوں کو اپنے پنکھوں کی آہنی گرفت میں لے لیتی ہے...... میں بے تحاشہ چیخنے لگتا ہوں۔''

''میں نہیں مروں گا...... میں نہیں مروں گا...... مجھے کچھ نہیں ہوا ہے...... مجھے کچھ نہیں ہوا ہے......''

# لمس کی لذت

یوں تو راحت اور میرے گھر کے درمیان کچھ دوری ہونے کے باوجود خانگی تعلقات بڑے گہرے تھے اور ہم لوگ اکثر و بیشتر معمولی سی معمولی تقریب میں بھی ایک دوسرے کے گھر آیا جایا کرتے تھے اور جب بعد میں چل کر راحت کی ماں نے میری ماں سے ایک دور کا رشتہ بھی کھوج نکالا تو اس تعلقات نے اور بھی زیادہ شدّت اختیار کرلی۔ اس طرح سے میری ماں راحت کی ماں کی اور بھی زیادہ چہیتی ہوگئی۔

میں جب بھی اپنی تعلیم گاہ سے پڑھائی کے دن کاٹ کر گھر آیا کرتا تھا تو راحت مجھے اکثر و بیشتر اپنے گھر کے سامنے والی سڑک پر ہی اپنی تمام کی تمام شوخ و چنچل سہیلیوں کے ساتھ ریت کے گھروندے بناتے و بگاڑتے ہوئے مل جایا کرتی تھی۔ مگر اس نے ہماری آنکھوں میں خارش اس وقت پیدا کی جب میں بی۔ اے پارٹ ون کا ایگزام دے کر گرمی کی چھٹیاں گزارنے کے لئے گھر آیا ہوا تھا۔ ایک روز کی بات ہے گرمی بلا کی تھی بھابی جان نہانے کے لئے باتھ روم جارہی تھیں جیسے ہی انہوں نے باتھ روم میں پہلا قدم رکھا اور قریب تھا کہ اب دوسرا قدم بڑھاتیں کہ اچانک پاؤں بدن کے بار کی تاب نہ لاکر پھسل گیا۔

اور پھر وہ دوسرے ہی لمحے چاروں شانے چت گریں اور فوراً ہی بے ہوش ہوگئیں۔ بھائی جان میونسپلٹی میں ایک اچھے سے عہدے پر متمکن تھے۔ گھر میں کسی طرح کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ہر طرف خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ جس کی وجہ سے ان کے بدن میں تہہ بہ تہہ

چربی جم گئی تھی اور جسم کچھ زیادہ ہی موٹا ہو گیا تھا۔ پھر اوپر سے اُمید سے بھی تھیں۔

میں بڑی تیزی سے بذریعہ سائیکل ڈاکٹر کو لینے کے لئے جا رہا تھا۔ راحت اور اس کی سہیلیاں حسب معمول مٹی کے گھروندے بنانے و بگاڑنے میں لگی ہوئی تھیں۔ گھنٹی کی آواز سن کر تمام لڑکیاں سڑک پر سے ادھر اُدھر کو بھاگیں۔ مگر راحت بڑی ڈھٹائی سے شکاری پرندے کی طرح اپنے ناخنوں اور پنجوں سے زمین کو کریدتی رہی۔ میں غصّے سے کانپتا ہوا۔

''اے ..... بے چھوکری مرنا ہے کیا......'' کہتا ہوا اس کے سامنے ہی سائیکل سے اتر پڑا۔ وہ جوں کی توں بیٹھی رہی۔ وہ لال رنگ کا فراک پہنے ہوئی تھی۔ جو پرانا ہو جانے کی وجہ سے جگہ بہ جگہ سے مسکا ہوا تھا اور نیچے کالے رنگ کی چڈی، فراک کو اس نے گندہ ہو جانے کے خدشے سے آگے پیچھے سے سمیٹ کر اپنی گود میں ڈال رکھا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی رانیں و پنڈلیاں بالکل ننگی تھیں اور جس پر ہلکے سنہرے رنگ کی ریت کے باریک باریک ذرّے جمے ہوئے تھے۔

میں اُس کو برا بھلا کہے جا رہا تھا مگر وہ میری باتوں پر توجہ دیئے بغیر اپنی ترچھی نظروں سے مجھے گھورے جا رہی تھی۔ اس نے جب دیکھا کہ میں کسی طرح سے ٹل نہیں رہا ہوں تب وہ اپنی ہی جگہ پر تن کر کھڑی ہو گئی۔ میری نظریں اس کے رخسار کا طواف کر کے اس کے سینے پر اٹک گئیں۔ وہ ابھی کمسن تھی اس لئے فراک کے کافی تنگ ہونے کے باوجود اس کے سینے کا ابھار ابھی ٹھیک سے نمایاں نہیں ہوا تھا۔ میں نے وہاں پر کھڑے کھڑے جو ایک خاص بات نوٹ کی وہ یہ کہ اس لڑکی کے چہرے سے گوشت خور پرندوں کی جیسی بے رحمی مترشح ہو رہی تھی۔ وہ اب بھی جوں کی توں کھڑی تھی۔ کچھ دور آگے بڑھنے کے بعد میں نے جیسے ہی گردن گھما کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ اچانک میری نظر اس کی نظر سے ٹکرائی۔ پھر وہ دوسرے ہی لمحے زوروں سے......

''اے!۔۔۔ بے چھوکری مرنا ہے کیا؟۔۔۔ اے!۔۔۔ بے چھوکری مرنا ہے

کیا؟۔۔۔'' کی رٹ مارتے ہوئے اپنے گھر کی طرف بھاگی۔

اب روز کا معمول ہوگیا کہ اب جب کبھی بھی میں ادھر سے گزرتا، وہ پہلے ہی سے اے بے چھوکری، اے بے چھوکری کی رٹ لگانی شروع کر دیتی اور میں غصّے میں تیزی سے نظر جھکائے اس کو کچھ کہے بغیر آگے کو بڑھ جاتا۔ اس کی اس بات سے فوری طور پر مجھے کچھ نہ کچھ جھنجھلاہٹ ضرور ہوتی، مگر جلد ہی میرے دل کے اندر ایک ایسا جذبہ بھی پیدا ہوگیا جو مجھے بے تحاشا اس کی طرف کھینچے جا رہا تھا۔

دن گزرتے رہے، یہاں تک کہ میری چھٹی کے دن ختم ہوگئے اور پھر میں پڑھائی کے دن کاٹنے کے لئے۔ یونیورسٹی واپس آ گیا۔ یونیورسٹی کی ہماہمی چہل پہل میں راحت کو کچھ بھول سا گیا۔ مگر اس کے باوجود کبھی کبھی تنہائی میں اور اکثر رات کو سوتے وقت دل کے کسی نہ کسی نہاں خانے میں مجھے اس کی یاد ضرور آ جاتی اور پھر میرا دل ودماغ اے!...... بے چھوکری ......اے!...... بے چھوکری...... کی رٹ سننے کے لئے بیقرار ہو جاتا۔

میرا پڑھائی کے دنوں میں گھر آنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ ان دنوں مجھے اکثر ایسا محسوس ہوا کرتا تھا کہ میری تعلیم میں مجھ سے کہیں زیادہ میرے گھر کے بڑے بوڑھوں کا مفاد وابستہ ہے۔

جاڑے کی چھٹی میں مجھے یہ کہہ کر گھر آنے سے روک دیا جاتا کہ چھٹی بہت کم دنوں کی ہے اور پھر سفر میں کافی مشقت بھی اٹھانی پڑتی ہے۔ لہٰذا ان چھوٹی چھوٹی چھٹیوں میں گھر آنے کے بجائے تم وہیں رہ کر غیر درسی کتابوں کا مطالعہ کیا کرو اس سے دل ودماغ روشن ہوگا۔ چنانچہ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے اپنے گھر کے بڑے بوڑھوں کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کرنا ہی پڑتا۔

جب میرا بی۔اے پارٹ سیکنڈ کا امتحان شروع ہوا اور قریب تھا کہ اب ختم ہو کہ اچانک ابا جان کا ایک طویل خط آیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ۔

''تمہارا بی اے پارٹ سیکنڈ کا امتحان اب قریب الختم ہوگا اور پھر کچھ ہی دنوں میں فائنل کی کلاسیں شروع ہو جائیں گی۔ میرا خیال ہے کہ گرمی کی اس چھٹی میں گھر آنے کے بجائے وہیں پر رہ کر ابھی سے فائنل ائر کی تیاری شروع کر دو۔ بی اے کے رزلٹ پر ہی تمہاری آئندہ کی تعلیمی زندگی کا انحصار ہوگا۔''

مگر بھلا وہ جس نے اس چھٹی کے انتظار میں پڑھائی کے دن گن گن کر کاٹے ہوں۔ جس کے دل و دماغ میں بھولی بسری یادیں کچوکے لگایا کرتی ہوں۔ اس پر بھلا کس کا زور چل سکتا تھا، چنانچہ جیسے ہی میرا سیکنڈ ایئر کا امتحان ختم ہوا۔ میں بلا کسی پس و پیش کے گھر کے لئے روانہ ہو گیا اور گھر پر آ کر یہ عذر لنگ تراش دیا کہ طبیعت تو امتحان سے قبل ہی خراب ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ آرام کی ضرورت ہے اور میں نے سال ضائع نہ ہو جائے اس خوف سے امتحان دے ڈالا۔ اب جبکہ امتحان ختم ہو گیا ہے تو ڈاکٹر نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں پورے طور سے آرام کروں اور یہ چیز وہاں پر رہ کر ممکن نہیں تھی۔ آپ کا خط پا کر نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے گھر آنا پڑا۔

شروع شروع میں دو چار روز تو میں مریض کی صورت بنائے کبھی اس گھر میں تو کبھی اس برآمدے میں پڑا رہتا۔ مگر کب تک، میں پابندی سے ضرورت بلا ضرورت راحت کے گھر کے چکر لگانے لگا۔ میرے اور اس کے گھر کے درمیان کچھ تو تعلقات پہلے ہی سے تھے۔ میں نے اپنے اس عمل سے اس میں اور بھی زیادہ وسعت پیدا کر دی۔ اس کے ابو و امی میرا بڑا خیال رکھتے تھے۔ اس کے ابو شہر میں سرکاری نوکری کرتے تھے۔ اگرچہ نوکری بہت معمولی تھی مگر جلد ہی محکمہ نے ان کے نام سے رہائش گاہ الاٹ کر دی۔ جس کی وجہ سے وہ اب گھر پر بہت کم آتے تھے۔ راحت کی ماں شوہر کی طویل غیر حاضری کو دیکھ کر خود ہی وہاں جا کر ہفتہ عشرہ گزارا آیا کرتی تھی۔

مجھے اب راحت سے محبت ہو چکی تھی اور وہ اس لئے بھی کہ جب تک میں اس

کے گھر میں موجود رہتا وہ مسلسل گھر کے کسی نہ کسی گوشے سے میری طرف دیکھا کرتی۔ میں اس کی دھکتی ہوئی نظروں کی تاب نہ لاکر ادھ مرا سا ہو جایا کرتا اور پھر میں یہ سوچ کر اپنے قدم باہر نکال لیتا کہ اب پھر کبھی راحت کے یہاں نہیں آؤں گا۔ مگر مجھے اپنے اوپر قابو رکھ پانا ناممکن سا ہوتا تھا۔

اس کا کنول کی طرح کھلا ہوا چہرہ باداموں جیسی آنکھیں اور شکر پارے جیسے ہونٹ بے جھجک قہقہہ۔ غرض یہ کہ اس کا سب کچھ میرے لئے باعث کشش تھا۔ راحت بھی اب ریت کے کھلونے بنا بگاڑ کر تھک چکی تھی۔ میں جیسے ہی اس کے گھر میں داخل ہوتا وہ اپنے تمام کام کاج کو چھوڑ کر میرے بغل میں آ بیٹھتی۔ اگر ماں گھر میں موجود ہوتی تو تھوڑا بہت اِدھر اُدھر بھی کر لیتی وگرنہ مستقل طور سے میرے پاس ہی بیٹھی رہتی اور پھر آہستہ آہستہ اپنی معصومیت میں وہ میرے اتنے قریب آجاتی کہ میری کہنیاں اس کی کہنیوں سے اس کا شانہ میرے شانے سے رگڑیں کھانے لگتا۔ اس کا پاؤں الگ نیچے میرے پاؤں سے ٹکراتا رہتا۔ وہ بڑے اطمینان سے اپنی ٹھڈی میرے کندھے پر ڈال دیتی۔ پھر وہ میری شرٹ کے بٹن کھول کر دھیرے دھیرے اپنی انگلیاں میرے سینے پر گھمانے لگتی۔ میرے سارے بدن میں چنگاریاں سی بھڑکنے لگتیں۔ لامحالہ میں بھی اپنی بانہیں اس کی کمر میں حمائل کر دیتا اور اس کو اتنا تنگ کرتا اتنا تنگ کرتا کہ وہ میرے سینے سے چپک کر رہ جاتی۔ پھر میں اسے اتنا بھینچتا اتنا بھینچتا کہ اس کے بدن کی ہڈیاں تک چٹخنے لگتیں۔ میں شدت جذبات سے اس کے ہونٹ اور گردن کا بوسہ لینے سے خود کو نہ روک پاتا۔ مجھے ایسا لگتا کہ جیسے کہ میں نے جانتے بوجھتے ہوئے انگارے پر ہونٹ رکھ دیا ہو یا پھر تپتا ہوا لوہا چوم لیا ہو۔

ایک روز کافی دنوں کے بعد جب میں عین دوپہر کو اس کے یہاں پہنچا تو میں نے اُس کو کچھ پریشان سا پایا بڑی مشکل سے میرے پاس آئی باتوں ہی باتوں میں اس نے مجھے بتایا کہ آج سویرے کی بات ہے کہ دادی اور امّی کے درمیان کافی تو تو میں میں ہوگئی اور

نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ امی غصے میں نانی کے یہاں چلی گئیں۔ بات کچھ بھی نہیں تھی آپ جانتے ہیں کہ بارک چچا کتنے صاف دل کے آدمی ہیں۔ وہ ہم لوگوں کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ وہ ابو کی غیر موجودگی میں گھر کے بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے کام کوانجام دیتے ہیں۔ ہوا یہ کہ وہ کل شام کو امی سے ملنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ ہم لوگوں کو تو امی جان نے کھلا پلا کر سویرے ہی سلادیا ادھر باتوں کا سلسلہ اتنا طول پکڑا کہ ان کو یہیں کافی رات ہوگئی۔ اندھیرے کے ساتھ ساتھ ہر طرف سناٹا برپا تھا، کتے بھونک رہے تھے۔ امی جان نے ان سے کہا۔

''ایسے ہو کے عالم میں کہاں جایئے گا...... یہیں سوجایئے......''

وہ امی کی بات مان گئے اور یہیں سو گئے۔ ابھی ٹھیک سے صبح بھی نہیں ہوئی تھی کہ نہ جانے کہاں سے دادی جان آٹپکی۔ انہوں نے فوراً ہی زمین و آسمان کو ایک کردیا۔ وہ کہنے لگیں۔

''وہ مُوا بدنام زمانہ یہاں کیوں آیا۔۔۔''

اب آپ ہی بتایئے نا کہ وہ ہم لوگوں کے لئے کتنا کچھ کرتے ہیں اگر وہ ایک رات بحالت مجبوری ہمارے یہاں سو ہی گئے تو کیا ہوگیا۔ اس طرح کے اور بہت سے واقعات۔

اس کے بعد کئی دنوں تک میرے حالات نے اس بات کا موقع نہیں دیا کہ میں راحت سے مل سکوں۔ یہاں تک کہ میری چھٹی کے دن بھی ختم ہوگئے۔ میں نے سوچا کہ کوئی خوبصورت سا بہانہ تراش کر کچھ دن اور گھر پر رہ لوں مگر پھر فوراً ہی خیال آیا کہ اگر میری اس ایکٹنگ کا ابا حضور کو کسی طرح سے احساس ہوگیا تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گھر سے بے گھر کردیں گے۔ چنانچہ میں بلا کسی پس و پیش کے یونیورسٹی کے لئے روانہ ہوگیا۔

اب میری پڑھائی لکھائی میں طبیعت بالکل ہی نہیں لگتی تھی۔ مجھے کھانا پینا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ جس کی وجہ سے میں کافی دبلا ہوگیا۔ میرے دل و دماغ میں ۲۴ گھنٹے راحت ہی

بسی رہتی۔ مجھے ابا حضور کے خوف و احترام میں یونیورسٹی میں پڑھائی کے دن کاٹنے تھے سو میں ایسا کر رہا تھا اور جیسے ہی فائنل ائر کا امتحان ختم ہوا، میں گھر آ گیا۔ یہاں آتے ہی میرے ساتھ کچھ ایسی مجبوری آن پڑی کہ میں دس پندرہ دن تک راحت سے نہیں مل سکا۔

ایک دوپہر کو میں اس کے گھر جا ہی رہا تھا کہ اچانک اس سے راستے میں ملاقات ہو گئی۔ وہ لال رنگ کا لہنگا اور اسی رنگ کی چولی پہنے ہوئے تھی۔ اس نے لہنگے کی ڈور کو کچھ اس ڈھنگ سے باندھ رکھا تھا کہ کولہوں کا ابھار اور کمر کا نازک پن بڑی دلکشی سے نمایاں ہو رہا تھا۔ دوسری طرف جب کبھی بھی تھوڑے سے وقفے کے لئے بھی اس کے سینے پر سے دوپٹہ سرک جاتا تو اس کی چھاتیاں مجھے دعوتِ نظارہ دے بیٹھتیں۔ اس کی چھاتیاں کسی ہوئی چولی میں کچی ناسپاتیاں معلوم ہو رہی تھیں۔ جب تک وہ میرے سامنے کھڑی رہی، میرے دل و دماغ نے کتنی ہی بار مجھے اکسایا کہ میں ان کو کچر کچر چبا کر حلق کے نیچے اتار لوں۔ وہ جب تک کھڑی رہی اس نے جمائیوں و انگڑائیوں کا تانتا باندھ دیا۔

راحت اس وقت مجھے کسی کارتوس بھری بندوق سے کم خطرناک نہیں نظر آ رہی تھی۔ علیک سلیک کے بعد وہ میری بے توجہی کا شکوہ کرنے لگی، کہنے لگی۔

''آپ کو اتنے دن یہاں آئے ہوئے ہو گئے...... مگر آپ ابھی تک ایک بار بھی ہمارے گھر نہیں آئے......'' میں اس کو طرح طرح سے اپنی مجبوریاں بتانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر وہ کسی بھی طرح ماننے کو تیار نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے آخر میں مجبور ہو کر اُس سے کہا۔

''تمہارے سب شکوے بجا...... تم خود کیوں نہیں میرے یہاں آ گئی......''

کہنے لگی۔

''امی نے ہماری نقل و حرکت پر پابندی لگا دی ہے...... وہ کہتی ہیں کہ اب تم بچی نہیں کہ جہاں چاہو پھٹکو...... کل کی ہی بات ہے جب میں نہا چکی...... تو مجھے خیال آیا کہ دوپٹہ تو گھر ہی میں بھول گئی...... میں بنا دوپٹے کے ہی باتھ روم سے باہر نکل آئی۔ امی

نے جب مجھے اس حالت میں دیکھا تو ان کا پارہ چڑھ گیا...... کہنے لگیں...... ارے او کم بختی!۔۔۔ وہ ڈھائی گز کا دوپٹہ کس دن کے لئے ہے۔۔۔ کہ تو یوں ۔۔۔ چلی آرہی ہے۔۔۔ اب آپ ہی بتایئے نا۔۔۔ میں کیسے باہر نکلوں؟۔۔۔

میں نے کہا۔

''کیا میرا تمہارے یہاں آنا اور تم سے باتیں کرنا، لوگوں کی نگاہ میں نہیں کھٹکتا ہے؟...... میں بھی اب تمہارے یہاں نہیں آؤں گا......'' میری ان باتوں کو سن کر اس کے چہرے کا رنگ فق پڑ گیا۔

میں نے اس کے بے رونق اور پژمردہ چہرے کو دیکھ کر کہا۔

''ایک شرط پر آتا رہوں گا......''

شرط لفظ سن کر پہلے تو وہ ذرا ٹھٹکی۔ پھر بولی۔

''کون سی شرط ہے؟...... میں بھی تو سنوں......''

میں نے کہا۔''وہ...... ایسا ہے کہ......''

میرے اس جملے کو سن کر اُس کے گال سرخ ہو گئے، اس کی پلکیں جھک گئیں اور اس کی بغلیں پسینے سے بھیگ گئیں، پہلے تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔

پھر فوراً ہی بولی۔

''اچھا ٹھیک ہے...... شام کو ٹھیک ۶ بجے میرے گھر آجایئے...... میں انتظار کروں گی......''

میں اس سے جدا ہو کر اسی وقت سے ۶ بجے کا انتظار کرنے لگا۔ ابھی ۶ بجنے میں کچھ منٹ باقی ہی تھے کہ میں اس کے یہاں پہنچ گیا اور گھر کی چوکھٹ کے پاس ہی ایک کرسی پڑی تھی۔ میں اس پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ اتنے میں، میں نے دیکھا کہ وہ باورچی خانے سے خراماں خراماں نکلی اور کہنے لگی۔

''امی گڑیا خالہ کی بڑی بیٹی جو دو سال کے بعد اپنے سسرال سے آئی ہے۔اس سے ملنے اس کے گھر گئی ہوئی ہیں.....''

اس وقت اُس کے گھر میں ہم دونوں کے علاوہ اس کی چھوٹی بہن اور ایک چھوٹا بھائی بھی تھا۔جن کو ہم لوگوں سے خاص دلچسپی نہیں تھی ۔وہ اپنے کھیل کود میں لگے ہوئے تھے۔میں نے بات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے راحت سے کہا۔اپنے وعدے کا کچھ خیال ہے اس نے کہا کیا۔کون سا وعدہ؟......ہائے اللہ!......میں نے تو کوئی وعدہ نہیں کیا ہے۔میں نے کہا راحت مذاق کا وقت نہیں ہے، مجھے کہیں باہر جانا ہے۔بس خدارا اب جلدی سے آ بھی جاؤ۔وہ حیلوں بہانوں سے مجھے ٹرخانے کی کوشش کرتی رہی۔پھر بولی۔

''اچھا ٹھیک ہے......میں آرہی ہوں...... مگر وہ ایسا ہے نا آپ کے منہ سے سگریٹ کی بو آرہی ہے......''

میں نے کہا۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے......''پاس ہی پانی سے لبالب بھرا ہوا جگ پڑا ہوا تھا میں نے کہا۔جگ اٹھاؤ میں ابھی کلی کر لیتا ہوں۔

وہ بولی۔

''نہیں رکیے......میں آپ کو گلاس میں پانی دیتی ہوں......''وہ گلاس لینے کیلئے جیسے ہی گھر میں گھسی میں بھی اُس کے پیچھے ہولیا۔وہ مجھے اپنے پیچھے پاکر بُری طرح گھبرا گئی۔میں نے کوئی دقیقہ ضائع کئے بغیر اس کا بایاں ہاتھ اور دایاں پاؤں پکڑ کر اس کو ایک جھٹکے سے اوپر اٹھایا اور پاس ہی پڑے بیڈ پر پھینک دیا۔وہ دھڑام سے گری اور پھر میں نے فوراً اس کو اپنی کہنیوں و گھٹنوں میں دبوچ لیا۔بالکل اسی طرح جس طرح سے ذبح کرتے وقت قصاب بکرے کو اپنی کہنیوں اور گھٹنوں میں دبوچے رکھتا ہے۔وہ بُری طرح سے گھبرا رہی تھی۔میرے اس غیر متوقع حملے سے اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔وہ کچھ

بولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر اس کے منہ سے صحیح آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ پوری طرح سے زور لگا رہی تھی کہ مجھے دھکا دے کر الٹ دے اور اٹھ بیٹھے۔ مگر اس کی لاکھ کوششوں کے باوجود بھی ایسا نہیں ہو پا رہا تھا۔ کیونکہ میں اس کے مقابلے میں کہیں بھاری پڑ رہا تھا۔ پھر کچھ ہی دیر بعد جیسے ہی میرے بدن کی گرمی اُس کے بدن تک پہنچی وہ رام ہو گئی۔

راحت نے اب اپنے پورے وجود کو میرے سپرد کر دیا اس کی سانسیں الٹی سیدھی چلنے لگیں۔ میرے بدن کا خون تیزی سے گردش کرنے لگا۔ میں راحت کے جسم کے ہر حصے پر بے تحاشا اپنی زبان رگڑنے لگا۔ ہونٹ گردن ...... کولہا، پنڈلی غرض کہ کوئی جگہ بچی نہیں۔ وہ اپنے نیم جان ہاتھوں سے جسم کے کچھ حصوں کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس کوشش میں اس کے جسم کی دوسری جگہیں نمایاں ہو جاتی تھیں۔ پھر میں اس پر بھی اپنی زبان رگڑنے لگتا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے راحت کے بدن سے چنگاری نکل رہی ہو بالکل اسی طرح جیسے چُھری پر سان چڑھاتے وقت چقماق سے نکلتی ہے۔ قبل اس سے کہ یہ معاملہ کچھ اور آگے بڑھتا اچانک مجھے کسی کے پاؤں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے جلدی جلدی اپنی الٹی سیدھی بے ترتیب سانسیں درست کیں اور گھر میں سے نکل کر باہر آ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت میری صورت ہونقوں کی سی ہو رہی تھی یا پھر جیسی لڑائی کے بعد مرغوں کی ہوتی ہے۔ راحت الگ اپنے بکھرے ہوئے کپڑوں کو لے کر گھر کے ایک کونے کی طرف بھاگ گی۔ چند ہی لمحے بعد اُس کی ماں داخل ہوئی۔ علیک سلیک ہوئی۔ انہوں نے مجھے اس طرح دیکھا جس طرح سے دام بھاؤ کرتے وقت قصاب بکرے کو دیکھتا ہے۔ میں ان کی گمبھیر نظروں کی تاب نہ لا کر کانپ اٹھا اور پھر فوراً ہی اپنی نظریں نیچی کر لیں۔ وہ سب کچھ تاڑ گئیں۔ مگر کیا کر سکتی تھیں۔ گھر کا معاملہ تھا وہ آنگن میں رسی سے لٹک رہے کپڑوں کو بلاوجہ الٹنے پلٹنے لگیں۔ میں چاہ رہا کہ یہاں سے فوراً دفع ہو جاؤں۔ مگر مصلحتاً رُکا رہا۔ کچھ دیر بعد راحت ہاتھ میں گلاس لئے ہوئے آئی اُس نے اپنے ڈوپٹے کو سنبھالتے ہوئے جگ سے

پانی نکال کر گلاس کو میری طرف بڑھایا۔

ایک لمحے کے لئے اس کی نظر میری نظر سے ٹکرائی۔ وہ بڑی مغموم و پریشان نظر آ رہی تھی۔ اس کا بدن کانپ رہا تھا، اس کی آنکھیں سرخ اور ہونٹوں کے کونے پھڑک رہے تھے، مگر زبان سے اس نے کچھ نہیں کہا۔ اس کی قربت کا اب بھی میرے دل و دماغ پر نشہ طاری تھا۔ میں نے بمشکل ہی ایک دو گھونٹ پانی پیا ہوگا اور آنے والی مصیبت کا احساس کر کے میں فوراً وہاں سے چلتا بنا۔ باہر کی کھلی فضا میں مجھے کچھ راحت کا احساس ہوا۔

پھر پانچ چھ روز تک راحت سے میری ملاقات نہ ہو سکی نہ وہ میرے گھر آئی اور نہ میں خود بھی اس کے یہاں گیا۔ ایک روز راستے میں اچانک اس کی چھوٹی بہن سے ملاقات ہوگئی۔ اس نے میرے استفسار پر بتایا۔

"آج آپا کو شہر گئے ہوئے تقریباً سات روز ہو گئے...... وہیں ان کے امتحان کا سینٹر ہے......"

میں دل مسوس کر رہ گیا اور سوچنے لگا کہ نہ جانے اس بے چاری معصوم پر میری وجہ سے کیا گزری ہوگی۔ مجھے اپنے اوپر بڑا غصہ آ رہا تھا۔ پھر ایک روز جب میں شہر کے بس سٹاپ پر گھر آنے کے لئے بس کے انتظار میں تھا کہ اچانک میری راحت اور اُس کے ابو سے ملاقات ہوگئی۔ علیک سلیک کے بعد میں نے راحت سے بات کرنے کی کوشش کی مگر اس نے میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ پھر فوراً مجھے احساس ہوا کہ اس روز جو کچھ بھی ہوا اس کو اس کی ماں نے محسوس کر لیا تھا اور اس کے ساتھ سختی سے پیش آئی ہوگی۔ لہٰذا اب کسی طرح سے ممکن نہیں ہے کہ راحت مجھ سے تعلق رکھے۔ پھر ساتھ ہی یہ بھی خیال آیا کہ اتنا بڑا واقعہ ہو گیا ہے، ممکن نہیں ہے کہ اس کی ماں نے اپنے شوہر سے سب کچھ نہ بتایا ہو، بیوی شاید ہی کوئی بات اپنے شوہر سے پوشیدہ رکھتی ہے۔ اس کے والدین مجھ سے کتنے پیار سے پیش آتے تھے اور مجھ سے کتنی بڑی نازیبا حرکت سرزد ہوگئی اور یہ سب کچھ سوچ کر فوراً

ہی میرا بدن شرم سے پانی پانی ہو گیا۔

میں نے ان لوگوں سے ترکِ تعلقات میں ہی عافیت سمجھی اور ان کے یہاں جانا یک قلم موقوف کر دیا اور آہستہ آہستہ اس بات کی بھی کوشش کرنے لگا کہ جیسے بھی ممکن ہو گا، میں راحت کے خیال کو اپنے دل سے نکال پھینکوں گا۔ اب مجھے اپنا ہی پیارا گھر کاٹ کھانے لگا تھا۔ ہر وقت میرے اوپر مایوسی و اداسی چھائی رہتی تھی۔ مجھے کھانے پینے سے ایک طرح کی نفرت سی ہو گئی جس کی وجہ سے میری صحت بُری طرح سے متاثر ہو رہی تھی۔

پھر ایک روز میں نے اعلان کر دیا کہ اب مجھے آگے کی کلاس میں داخلہ لینا ہے اور فارم پر میں نے چونکہ یونیورسٹی کا ہی پتہ لکھا ہے۔ اس لئے پہلے سے میرا وہاں موجود رہنا بہت ضروری ہے۔

میرے گھر والے میری گرتی ہوئی صحت کو دیکھ کر پہلے تو جانے دینے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ مگر میرے مسلسل اصرار کے آگے انہوں نے سر تسلیم خم کر دیا۔ میں یونیورسٹی آ گیا، کچھ دن بعد میرا داخلہ بھی آگے کی کلاس میں ہو گیا بلکہ کلاس بھی شروع ہو گئی۔ مگر میں راحت کے خیال کو لاکھوں کوششوں کے باوجود بھی دل سے نکال نہ سکا۔

جاڑے کی چھٹی قریب تھی، ایک دن گھر سے امّی کا خط آیا۔ جس میں لکھا تھا۔

"وہ جو تمہاری آنٹی ہیں فتن بی ان کی بڑی لڑکی ساحرہ کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی ہے وہ بے چاری تمہیں کتنا چاہتی تھی، اس کی شادی میں تمہارا شریک ہونا بہت ضروری ہے۔ جیسے ہی جاڑے کی چھٹی شروع ہو تم گھر چلے آؤ۔ چنانچہ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے امّی کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑا اور جیسے ہی چھٹی کا اعلان ہوا میں گھر آ گیا۔

راستے میں، میں نے عزم مصمم کر لیا کہ چاہے کچھ بھی ہو، میں ایک بار ضرور راحت سے ملوں گا اُس کو اپنا ایک ساتھ مرنے جینے کا وعدہ یاد دلاؤں گا۔ وہ ضرور ہمارے پرانے تعلقات کا خیال کرے گی۔

میں جیسے ہی گھر پہنچا۔ مجھے کچھ ہی دیر بعد معلوم ہوا کہ راحت کے والد کی حالت شدید خراب ہے۔ان پر فالج کا حملہ ہوا ہے،شہر کے ہی سرکاری ہسپتال میں داخل کروایا گیا ہے۔راحت کی ماں بھی کئی دنوں سے وہیں ہے۔ گھر میں راحت کے علاوہ کوئی نہیں ہے، میں نے موقع کو غنیمت سمجھا اور جلدی جلدی غسل کیا۔تھورا بہت ناشتہ کیا اور فوراً راحت کے یہاں آدھمکا۔گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔وہ بجھی بجھی سی بے حس و حرکت پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی ۔ میں اس کے قریب ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ وہ کچھ بولے۔مگر وہ زبان پر مہر سکوت لگائے سوالیہ نظروں سے مجھے گھورتی رہی، بہت دیر کے بعد اُس نے مجھے بتایا کہ اس روز تو آپ کا کچھ نہیں ہوا، آپ چلے گئے، مگر میرے اوپر تو قیامت گزر گئی۔ امّی نے مجھے کافی مارا پیٹا اور بُرا بھلا بھی کہا۔ پھر اگلے دن ہی جب میں ان کے ساتھ امتحان کے لئے شہر جارہی تھی تو وہ مجھے راستے بھر طعنہ دیتی رہیں۔ایک مرتبہ تو غصے میں یہاں تک بول گئیں۔

''ہم بھی کسی کی بیٹی ہیں......اور ہم بھی کبھی حسین و جوان تھیں......ہمارے حسن و جوانی نے بستی کے جوان لڑکوں کی نیندیں حرام کردی تھیں...... مگر کیا مجال ......جو کسی نے ہماری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا ہو......ہمارا کریکٹر ہی ایسا نہ تھا..... اور ایک تم ہو کہ ٹھیک سے جوان بھی نہیں ہوئی ہو، مگر!!.....ابھی سے یہ عالم ہے......!!!''

میں نے کہا۔

''کیا تم امّی کی ان باتوں کو صرف سنتی ہی رہی؟...... کہ تم نے بھی کچھ کہا.....''

راحت نے برملا جواب دیا۔

''میں..... کب تک چپ رہتی .....جب وہ اپنی بات ختم کرچکیں ..... تو.... میں نے کہا.....امّی مگر ایک بات ہے.... چاہے جوانی میں آپ پر کسی نے آنکھیں اُٹھائی ہوں یا نہ..... مگر اب جبکہ آپ چار چار بچوں کی ماں ہیں..... تو پاس پڑوس والے ہی

کیا؟...... بلکہ گاؤں والے تک آپ کی طرف انگلی اٹھانے لگے ہیں...... میری ان باتوں کو سن کر وہ آگ بگولہ ہوگئیں...... مگر کرتی کیا؟...... خاموش ہی رہیں......"

"دیکھئے نا!...... کل ابو کی ڈیوٹی پر ہی طبیعت خراب ہوگئی۔ مجھے پتہ بھی نہیں کہ آخر انہیں ہوا کیا ہے؟...... امی وہیں گئی ہوئی ہیں...... میں گھر میں بالکل اکیلی ہوں...... باہر نکلنے پر میرے اوپر پابندی بڑھ گئی ہے......"

اس کے پاس بیٹھے بیٹھے میں نے محسوس کیا کہ پارے سے بنی ہوئی یہ لڑکی جس کی رگوں میں بجلیاں بھری ہوئی ہیں، کسی بھی طرح سے اب بچی نہیں رہی بلکہ اب اس کے انگ انگ میں گوشت بھر گیا تھا اور اس کا بند بند جوان ہو گیا تھا۔ میں نے جلدی ہی محسوس کرلیا کہ بستی کے تمام لڑکوں کی رالیں اس پر ٹپکتی ہونگی۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد پھر میں راحت سے مخاطب ہوا۔

"کیا تم مجھ سے شادی کروگی؟......"

وہ بولی۔

"شادی میں اپنے والدین کی مرضی سے ہی کروں گی...... وہ جس کے پلے باندھ دیں گے...... آخری سانس تک اسی کے ساتھ بندھی رہوں گی......"

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اچانک راحت کے چچا بارک گیٹ سے داخل ہوئے۔ وہ ہم لوگوں کو محو گفتگو دیکھ کر دوسرے گیٹ سے فوراً ہی باہر نکل گئے۔

اب شام ہوگئی تھی۔ آس پاس کے گھروں سے کھسر پھسر کی آوازیں آنی شروع ہوگئی تھیں۔ میں نے راحت کے گھر میں اب مزید ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا اور پھر فوراً ہی وہاں سے چلتا بنا۔

کچھ دنوں بعد ہی راحت کے ابو اچھے ہوگئے اور حسب معمول ڈیوٹی بھی کرنے لگے۔ مگر میری اس دن کے بعد سے کئی ہفتوں تک راحت سے ملاقات نہ ہوسکی۔ میں اس

کے گھر کے پاس سے جب بھی گزرتا تو اپنی رفتار دھیمی کر دیتا کہ شاید کسی جھروکے سے راحت کا چہرہ نظر آجائے، مگر میری سخت کوششوں کے باوجود بھی ایسا نہ ہوسکا۔

ایک روز جب میں اپنے کسی قریبی رشتے دار کے یہاں سے دھوپ ولو کے خوف سے صبح ہی صبح اپنے گھر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ میرے پاس پڑوس کی عورتیں تیز آواز میں محو گفتگو ہیں اور ایک دوسری سے سبقت لیجانے کی کوشش کر رہی ہیں۔

ایک بولی۔

''تب تو میں نا کہوں کہ رنڈیا کا جسم کیوں اس طرح پھیلا جا رہا ہے۔۔۔۔۔ اب نا سمجھ میں آیا۔۔۔۔۔''

دوسری نے جملہ پورا کیا۔

''ارے!۔۔۔۔۔ آج بھانڈا پھوٹا ہے۔۔۔۔۔ تب نا۔۔۔۔۔ ان دونوں کا بہت دنوں سے عشق چل رہا تھا اور یہ دونوں رات کو لوگوں کی نظروں سے بچ کر آپس میں ملتے بھی تھے۔۔۔۔۔ وہ جو اتنا چمچماتی تھی۔۔۔۔۔ کہاں سے؟۔۔۔۔۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ سارا خرچ وہی لڑکا دیتا تھا۔۔۔۔۔''

تیسری عورت جو قریب ہی میں بیٹھی تھی۔ اس کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئی بولی۔

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔۔۔۔۔ آج جب میں صبح کُٹھولے میں لکڑی لینے گئی تو دیکھا کے چھمو کے ابا دروازے پر کسی سے کھسر پھسر کر رہے تھے۔

''اُس لڑکی کے تو شروع ہی سے لچھن ٹھیک نہیں تھے۔۔۔ میں جب بھی اس کے گھر کے قریب سے گزرتی سڑک سے گزرا۔۔۔ ہمیشہ ہی میں نے اُس کو گھر کی کھڑکی سے کسی نہ کسی منچلے سے محو گفتگو دیکھا۔۔۔ اور مجھے پورا یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن ضرور اپنے ماں باپ کی عزت پر بٹہ لگائے گی۔۔۔'' غرض یہ کہ جتنے منہ اتنی باتیں۔

ہوا یوں کہ ایک مرتبہ راحت کی ماں اپنی پلٹن سمیت میکے گئی ہوئی تھی۔ گھر میں

صرف راحت تھی ۔اس نے موقع غنیمت سمجھ کر ایک دن عین دوپہر کو جب سناٹا ہر طرف چھایا ہوا تھا۔اپنا کپڑا وغیرہ لے کر گاؤں والے تالاب پر نہانے کے لئے آدھمکی۔جب وہ پورے طور سے نہا چکی تو یہ سوچ کر کہ اوپر کپڑا بدلنے میں آسانی ہو،اس نے پانی میں ہی قمیص اتار کر اپنے سینے سے چپکا لیا اور کپڑا بدلنے کی غرض سے اوپر گھاٹ پر آ کر بیٹھ گئی ۔اُس نے بھیگی ہوئی قمیص کو اپنے سینے سے الگ کیا اور جلدی جلدی اپنی جوان چھاتیوں کو اپنے گھٹنوں میں چھپایا کہ مبادا کوئی دیکھ لے۔اس کے ننگے جسم پر پانی کی بوندیں موتیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔اس نے جیسی ہی قمیص لینے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا کہ یکا یک گھاٹ پر فتو حلوائی کا لڑکا ممو آدھمکا۔راحت نے جلدی جلدی اونے پونے کر کے اپنے کپڑے تبدیل کئے اور بھیگے ہوئے کپڑوں کو بغیر کھنگالے ہوئے ہی وہاں سے بھاگی۔

ممو لفافہ دیکھ کر ہی مضمون بھانپ چکا تھا۔اس کے منہ میں پانی آ گیا۔اس کو پڑھنے لکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی پھر بھی اس کے باپ نے پیروی سے شہر کے ایک اچھے کالج میں اس کا نام لکھوا دیا تھا۔مگر اس نے کالج کا منہ تک دیکھنا گوارا نہیں کیا۔بس دن بھر بستی کے لچوں لفنگوں کے ساتھ ادھر اُدھر بھاگا پھرتا اور جہاں کہیں بھی کوئی گدرائی ہوئی لڑکی نظر آ جاتی۔اس کو گھور گھور کر دیکھا کرتا۔

اس کے باپ نے بھی اپنی جوانی میں کم مزے نہیں لوٹے تھے۔میرے ایک دور کے ماموں تھے اب وہ اس دنیا میں رہے نہیں۔خدا ان کو بخشے،کہتے تھے۔

''میاں ہم لوگوں نے اپنی جوانی میں بڑے مزے لوٹے ......اس کا اب تم لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے ہو......وہ جو فتو حلوائی کی کوٹھڑی ہے نا......وہی ہم لوگوں کا اڈہ تھا......شام ڈھلے ہی ہم لوگ اس کوٹھڑی میں اکٹھا ہو جاتے اور پھر وہاں پر یہ فکر کرتے تھے کہ کس کی بہو،بیٹی گدرائی ہوئی ہے......رات گئے تک ہم لوگ باہم مشورے سے ایک نتیجے تک پہنچتے......جب بات پوری طرح سے طے ہو جاتی......تو ہم لوگ رات گئے

......اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے باہر نکلتے...... اگر اس کے گھر کا دروازہ بلا مزاحمت کے ہی کھل جاتا تو ٹھیک...... ورنہ سیڑھی لگا کر اس کے گھر میں اترتے اور اپنی ضرورت کو پوری کر کے بڑے دھڑلے سے وہاں سے نکلتے...... ہم لوگوں کا اتنا زیادہ رعب ودبدبہ تھا کہ گھر والے ذرا بھی چوں وچرا نہیں کرتے تھے۔ سیڑھی کو لانے لیجانے کی ذمے داری فتو حلوائی ہی کے سپرد تھی۔

وہ جو کہتے ہیں۔

''بُرے گوشت کا بُرا شوربہ......''

فتو حلوائی کا لڑکا ممّو اپنے باپ کے نام کو اور بھی زیادہ روشن کر رہا تھا۔ وہ بلا ناغہ راحت کے گھر کا چکر کاٹنے لگا۔ پہلے تو راحت اس کی مجنونانہ حرکت کو دیکھ کر ذرا ٹھٹھکی اور ایک روز تو اس نے دھمکی بھی دے ڈالی کہ اگر تم اپنی ان حرکتوں سے باز نہیں آئے تو میں اپنی امّی جان سے شکایت کر دونگی۔ پھر جو ہوگا، وہ تم دیکھتے رہنا۔ بہر حال راحت انسان ہی تھی۔ اس کا دل پگھل گیا اور وہ اس پر ریجھ گئی۔ پہلے تو اشاروں میں باتیں ہوتی رہیں اور پھر بعد میں چل کر خط وکتابت نے لے لی۔ ایک دن وہ بھی آیا جب محرم کے تعزیے کے جلوس میں دونوں کی ملاقات ہوگئی اور پھر ایک روز پروگرام کے مطابق جب کہ فتو حلوائی کے سالے کی بڑی لڑکی کی شادی تھی۔ فتو حلوائی اپنے اس منچلے لڑکے کو گھر پر ہی چھوڑ کر پریوار کے دیگر ممبروں کے ساتھ اس میں شرکت کے لئے گیا ہوا تھا۔ دونوں نے دن میں ہی رنگ رلیاں منانے کا پروگرام بنالیا اور رات گئے جب راحت کے گھر کے تمام لوگ سو گئے تو وہ پانی پینے کے بہانے اٹھی اور گھر کے پیچھے والے گیٹ سے نکل کر فتو حلوائی کے دروازے پر آگئی۔ پروگرام کے مطابق کوٹھڑی کھلی ہوئی تھی اور ممّو کروٹیں پر کروٹیں لے رہا تھا جیسے ہی راحت کوٹھری کے اندر داخل ہوئی وہ فوراً بستر پر سے اٹھا اور اندر سے کوٹھڑی کے دروازے کو بند کرلیا۔

قلن کی بیوی جس کو پانچ چھ روز سے پیچش تھی، پاخانے کے دروازے پر کھڑی

کھڑی یہ سب تماشا دیکھ رہی تھی۔ پہلے تو وہ راحت کو دیکھ کر بھوت پریت کا خیال کر کے ڈر گئی۔ مگر جب اس نے فوراً ہی اپنی آنکھوں پر زور ڈال کر دیکھا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور پھر وہ فوراً ہی چلا اٹھی۔

''ارے!...... یہ تو تمیزن بووا کی پوتی راحت ہے...... اتنی رات گئے یہاں کہاں آگئی؟...... ''اُس نے فوراً جا کر اپنی ساس کو جگایا اور اس بڑھیا نے تو جاگتے ہی فوراً زمین و آسمان ایک کر دیا اور پھر صبح ہونے سے پہلے ہی یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پورے گاؤں میں پھیل گئی۔

''تمیزن کی پوتی...... رات گئے فتو حلوائی کے لڑکے ممو کے ساتھ...... اس کی کوٹھڑی میں پکڑی گئی......''

جب میں نے عورتوں کی کھسر پھسر کی آوازیں سنی تو میرا چہرہ یوں کملا کر رہ گیا جیسے کہ کسی نے ربڑ کے غبارے میں کوئی سوئی چبھو دی ہو۔ مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس کے میرے علاوہ بھی کسی سے تعلقات ہو سکتے ہیں۔ مگر اب سب کچھ میرے سامنے ہی تھا۔ میرے ذہن میں اپنے ایک دوست ستیش کا واقعہ گردش کرنے لگا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے ایک قریبی دوست جس کا نام رمیش تھا اس سے ملنے کے لئے اس کے گھر گیا ہوا تھا۔ دروازہ بند ہونے کی وجہ سے باہر سے ہی وہ رمیش رمیش چلانے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد رمیش کی بیوی نے دروازہ کھولا۔ اس نے پوچھا۔

''بھابی جی!...... رمیش بھائی کہاں ہیں؟......''

رمیش کی بیوی نے غمگین لہجے میں جواب دیا۔

''اُن کو سورگباسی ہوئے مہینوں ہو گئے......''

پہلے تو وہ شدت غم سے کانپنے لگا۔ پھر فوراً ہی اپنے حواس پر قابو پا کر سورگیہ کی بیوی سے مخاطب ہوا۔

''بھابی جی! ...... یہ سب کچھ ہوا کیسے؟ ......''

اس کی بیوی نے بتایا۔

''رات کا وقت تھا...... ہم دونوں ایک ہی پلنگ پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے ...... میرے منہ سے اچانک نکل گیا...... کہ اگر اس وقت ہری مرچ ہوتی تو کھانے کا مزہ دوبالا ہو جاتا......''

وہ بولے۔

''یہ کونسی بڑی بات ہے...... میں ابھی باغیچے سے توڑ کر لاتا ہوں...... وہ جیسے ہی وہاں پہنچے...... سانپ نے ان کو ڈس لیا...... پھر وہ وہیں ڈھیر ہو گئے......''

میرے دوست نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''بھابی جی! ۔۔۔ اس کے بعد آپ نے کیا کیا؟ ۔۔۔''

''میں نے لال مرچ سے ہی کام چلا لیا...... '' اس کی بیوی نے جواب دیا۔

میں نے ان ہنگاموں کے باوجود دل میں ٹھان لیا کہ ایک مرتبہ ضرور راحت سے ملوں گا۔ مگر میری یہ خواہش کسی طرح سے بار آور ہوتی ہوئی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے کئی مرتبہ خوبصورت خوبصورت بہانے تراش کر اس کے گھر بھی گیا۔ مگر جیسے ہی راحت کی نظر مجھ پر پڑتی وہ دوڑ کر گھر میں چھپ جایا کرتی۔ ایک روز میں اس کے گھر کے قریب سے گزر رہا تھا۔ میری آوارہ نظریں اچانک اس کے گھر کے گیٹ کے پردہ پر پڑیں، پردے کو کچھ اس طرح سے لٹکایا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ زمین سے کافی اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔ میری نظر جیسے ہی پردے کے اوپر سے نیچے کو آئی۔ مجھے دو خوبصورت گورے گورے پاؤں نظر آئے۔ یہ پاؤں راحت کے تھے۔ میں نے زور سے ''سی'' کی آواز نکالی۔ اس نے پردہ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اُس کے دونوں کان کھڑے ہو گئے۔ بالکل اسی طرح سے جیسے کہ شکاری کی آہٹ پا کر ہرن کے ہو جاتے ہیں۔ اس نے فوراً ہی اپنی مجبور و بے بس نگاہوں سے میری طرف

دیکھا اور پھر اپنی نظریں نیچی کرلیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ اب بھاگی تو تب مگر نہیں راحت ویسی ہی کی ویسی نظر جھکائے کھڑی رہی۔ چہرہ اترا ہوا اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بنے ہوئے تھے۔ دونوں گال دھنسے ہوئے تھے۔ لمبے لمبے بال دونوں گالوں پر سوگوار سے لٹکے ہوئے تھے۔ دوپٹہ مُڑا تُڑا گردن سے لٹکا ہوا تھا۔ اداس اداس خیالوں میں کھوئی ہوئی شوخیاں نہ جانے کہاں غائب ہوگئی تھیں۔ میری آنکھوں میں فوراً اپنے کمرے میں آویزاں اگلے وقت کے ایک مصور کی عصمت گنواں بیٹھنے والی لڑکی کی تصویر پھر گئی۔ جو آج بھی میرے کمرے میں آویزاں ہے۔ میں آج بھی یونیورسٹی میں پڑھ رہا ہوں اور بالاناغہ گرمی، سردی، عید، بقر عید کی چھٹی میں گھر جاتا ہوں اور کبھی کبھی تو ان چھٹیوں کے بیچ میں بھی چلا جاتا ہوں۔

راحت آج بھی بغیر شوہر کے ہی ہے۔ اگرچہ اس کے ساتھ کی اکثر لڑکیاں شادی کرکے مائیں بن چکی ہیں۔ مجھے اب راحت سے ملتے ہوئے ایک گھٹن سی محسوس ہوتی ہے۔ اگر وہ مجھے کہیں سڑک پر نظر آجائے تو میں دور سے ہی راستہ کاٹ لیتا ہوں اور اگر کبھی کسی گلی میں اچانک مڈبھیڑ ہوجاتی ہے تو میں تیزی سے سر جھکا کر آگے بڑھ جاتا ہوں۔ آخر میں کیا کروں...... مجھے پھولوں میں گلاب پسند ہے...... میں گیندے پر بھی قناعت کرسکتا ہوں، بشرطیکہ نچا کھچا ہوا نہ ہو......

میری اب تک کی زندگی میں سینکڑوں لڑکیاں نہ جانے کہاں سے آئیں اور پھر وہ کدھر کو چلی گئیں۔ مجھے پتہ تک نہیں چلا...... مگر ہائے وہ راحت کے بدن کی لمس کی لذت جس کو میں آج بھی بھلانے کی لاکھ کوششوں کے باوجود چلتے پھرتے، سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے ہوئے محسوس کرتا رہتا ہوں۔

☆☆☆

مجاہد الاسلام سمیلوی